مرتبہ

محمد امین زبیری

فیاض منزل - آگرہ

التماس

محترم مولوی محمد امین صاحب زبیری کو تاریخ نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہی - آپ نے اس مختصر کتاب میں "انتخاب جداگانہ" کے اسباب و وجوہ کے علاوہ اُسکا تاریخی خلاصہ حسن و ضاحت اور ترتیب کے ساتھ کیا ہے وہ کسی اہم اقلیت کے گمراہ اور برگشتہ خیال افراد کی رہنمائی کیلئے قطعی کافی ہے بشرطیکہ اسے ایماندارانہ نظر سے دیکھا جائے - اور حقیقت حال کی تحقیقات بھی مطلوب ہو۔

اس کتاب کا نصف منافعہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نذر کیا جائیگا اور نصف شاخ ضلع مسلم لیگ آگرہ کو ملے گا۔ اسلئے باہمت اصحاب اسکی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ مدد فرمائیں۔

محمد فیاض خاں (صدر ضلع مسلم لیگ آگرہ)

تاریخ انتخابِ جُداگانہ

تمہید

یہ چند صفحات صرف ان مسلمان نوجوان کے لئے مرتب کئے گئے ہیں جو سیاسیات سے دلچسپی اور مستقبل پر نظر رکھتے ہیں اور جن کے شانوں پر قدرتی طور سے یہ بار عائد ہونے والا ہے کہ وہ سیاسیات میں اپنی قوم اور اپنے ملک کی رہبری کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کے سامنے اپنے ہشتاد سالہ ماضی ۱۸۵۷ تا ۱۹۳۶ء کی کوئی سیاسی تاریخ نہیں۔ اس لئے بعض اوقات ان کی آراء و افکار کا رجحان ایسی سیاست کی طرف ہو جاتا ہے جو بظاہر نہایت خوش آیند اور دلپذیر ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مسلمان قومیت کا پرتو نہیں ہوتا حتی کہ بعض پرجوش نوجوان ان اسلاف کو بھی جنہوں نے قومی سیرت کی تشکیل اور قومی ارتقا کی جد و جہد میں اپنی بہترین قوتوں کو صرف کیا نشانۂ ملامت بنانے میں دریغ نہیں کرتے۔ اسلئے ضرورت اور اشد ضرورت ہے کہ اردو میں ہمارے ماضی کی ایک مکمل تاریخ ہمیشہ نوجوان کے سامنے رہے۔

ہنوز یہ کوئی دشوار گذار مرحلہ نہیں۔ اگر کوئی قابل نوجوان تھوڑی سی کوشش کرے تو بہ احسن وجوہ اس مرحلہ کو طے کر سکتا ہے۔ ہماری سیاسی تاریخ کا ایک مستقل عنوان کمیونل ایوارڈ ہے۔ اسکے حسن و قبح اور ضرر و نفع کی بحث جُداگانہ ہے۔ لیکن

اس کے متعلق پہلی ضرورت اس امر پر غور کرنے کی ہے۔ کہ یہ کیوں کر وجود پذیر ہوا۔ اور کن کن مراحل سے گذر کر موجودہ مرحلہ پر ہے جس کے مسترد کرنے کے لئے ہندوؤں کی اکثریت حتیٰ کہ کانگریس بھی اصولاً تسلیم کر لینے کے بعد اب آخر ۱۹۳۶ میں اپنی پوری قوت صرف کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اور مسلمان اس پر اپنے سیاسی وجود و بقا کو منحصر سمجھتے ہیں۔ ان صفحات میں بہ سبیل اختصار اسی اوارڈ کی مختصر تاریخ بیان کی جائے گی۔ تاکہ مسلم نوجوان اپنے آرا و افکار قائم کرتے وقت اس کو بھی مطالعہ کر سکیں۔

بابِ اوّل

۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۱ء کا درمیانی زمانہ اس ملک میں مسلمانوں پر نہایت سخت گذرا ہے۔ ہنگامہ غدر کا سارا الزام ان کے سر ڈالا گیا۔ اور ان ہی سے شدید انتقام لیا گیا مختصر یہ کہ "کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانہ میں نہ ہوئی ہو۔ اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ گو وہ رام دین اور ماتا دین نے ہی کی ہو۔ کوئی بلا آسمان پر نہیں چلی۔ جس نے زمین پر پہونچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو"!

اس مصیبت کا سب سے سخت اثر دہلی، روہیلکھنڈ اور ان اضلاع میں تھا جہاں مسلمانوں کی زیادہ آبادی تھی۔ اس زمانہ میں (سر) سیّد احمد خاں بجنور میں سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے اس ہنگامہ کو فرو کرنے میں شریک تھے۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ مراد آباد تبدیل ہوئے اس ضلع پر حکومت کا سخت عتاب تھا۔ اور یہی ضلع مسلمانوں کا ایک بڑا غمکدہ بھی تھا۔ سر سید نے بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھوں سے

دیکھی تھی۔ اور یہاں اس تباہی اور بربادی کا اور بھی زیادہ عبرت خیز نقشہ ان کی نظر سے گذرا۔ اُنہوں نے بہ اقتضائے وقت بہت جرأت کے ساتھ اپنی قوم کی ہر ایک امکانی خدمت کی لیکن ساتھ ہی اُنہوں نے اسباب غدر پر بھی غور کیا۔ اور ۱۸۵۹ء میں "اسباب بغاوت" کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور چھپوا کر باوجود اپنے عزیز دوستوں کی فہمائشوں کے گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیجدیا۔ اس زمانہ میں یہ ایک ایسی جرأت کا کام تھا جس کو خدا نے صرف سید احمد خاں کے لیے ہی مخصوص کیا تھا۔ اس رسالہ میں اُنہوں نے ایک مُفصل بحث کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ:—

"سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائیداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں واجبات سے ہے۔ بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی۔ مگر لیجس لیٹیف کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اور ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا جو نہایت جاہل ہیں۔ اور بے تربیت لیجس لیٹیف کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا۔ اور کیا فائدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا اور اگر رعایائے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ کے لیجس لیٹیف کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ ان کے انتخاب کا کیا ہوتا اور اس میں بہت سی مشکلیں پیش آتیں۔ کیونکہ اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے لیے بہت اچھی اور نہایت ضرور تھی اور اس کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے اور طریقہ مداخلت

رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے۔ اس کو دیکھنا چاہیے۔ اور جو
بحث ہو وہاں کرنی چاہیے۔"

اس رسالہ کے اسی وقت سرکاری طور پر ہندوستان و انگلستان میں متعدد تراجم ہوئے
اور گورنر جنرل کی کونسل اور پارلیمنٹ میں اس پر بڑے بڑے مباحثے کئے گئے۔
۱۸۶۱ء میں جو فرسٹ انڈین کونسل ایکٹ نافذ ہوا۔ بلاشبہ اسکے نفاذ میں
سب نہیں تو ایک حد تک اسی رائے کا اثر ماننا پڑے گا۔ جس کو انگلستان کے بعض اخبارات
نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس ایکٹ میں اگرچہ مرکز اور صوبوں کی مجالس وضع قانون میں
صرف ہندوستانیوں کو نامزدگی سے حق شرکت حاصل ہوا تاہم اداراتِ حکومت
میں داخلہ اور رائے زنی کا دروازہ کھل گیا۔ ۱۸۷۸ء میں سرسید بھی اسی حق کی رو
سے گورنر جنرل کی کونسل میں ممبر مقرر ہوئے۔ اور ہندوستانیوں میں وہ پہلے شخص تھے
جنہوں نے اپنی ممبری کے زمانہ میں فائدہ عامہ کے بل پیش کئے[1] اور جو کثرت رائے سے
منظور ہوئے۔ انہوں نے متعدد قوانین کے مباحث میں زبردست تقریریں کیں لارڈ
رپن کے زمانہ میں جب جنوری ۱۸۸۳ء میں صوبہ متوسط کی لوکل سیلف گورنمنٹ کا بل
پیش ہوا ہے تو انہوں نے اپنی تقریر کے ضمن میں کہا تھا کہ :۔

"میں اس بات کے خیال سے خوش ہوں کہ میں اس قدر عرصہ تک زندہ رہا کہ میں
نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سیلف
ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں ریپریزینٹیو انسٹی
ٹیوشن پیدا کئے ہیں اور اس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا۔"

---

[1] یہ بل چیچک کے ٹیکہ اور قاضیوں کے تقرر کے تھے ۱۲

اس صوبہ کی حالت کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر انتخاب سے ، اور ایک ثلث نامزدگی سے قرار دیئے گئے تھے۔ سرسید نے اس کی تائید کرتے ہوئے جو زور دیا کہ یہی اصول پورے ہندوستان پر حاوی رکھا جاوے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ :۔

"ہندوستان فی نفسہ ایک برّ اعظم ہے۔ اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں اور مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جُدا رکھا ہے۔ اور ذات کا قاعدہ اب تک بڑے زور شور سے جاری ہے ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے باشندے ہوں۔ اور جس حالت میں کہ باشندوں کا ایک گروہ دولت مند اور صاحب تجارت ہو۔ تو دوسرا گروہ باعلم اور ذی رعب ہو۔ ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو۔ اور روشن ضمیری کے جس درجہ پر ایک گروہ باشندوں کا پہونچ گیا ہو۔ وہ بہ نسبت اس کے جہاں تک کہ باقی باشندے پہونچے ہوں۔ بہت اعلیٰ ہو۔ ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں میں اُن کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے۔ دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پرواہ نہ ہو۔ پس اِن صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہے۔ کہ ہندوستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکل اور سوشیل و پولیٹکل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے جہاں قومی امتیاز اب باقی نہیں رہا۔ اور جہاں

مذہبی معاملات میں تفرقہ و اختلاف تحمل کی ترقی کے سبب سے کم ہوگئے
ہیں۔ اس معاملہ میں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتی ہیں۔ قوم اور مذہب
کے متحد ہونے سے انگریزی قوم ایک قوم ہوگئی ہے۔ اور تعلیم کی ترقی سے
خفیف اختلافات اُن معاملات میں جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق
ہیں۔ بالکل ناچیز ہوگئے ہیں۔ عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطلب کی
حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں
ہوتا۔ اور درحقیقت سوشل و پولٹیکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جا سکتا ہے
کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے۔ بلاشبہ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان
کی نسبت ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ الیکشن کے ذریعہ سے ممبروں کے مقرر کرنے
سے رعایا کا ایک حصہ کی رائے اور مطالب کی حمایت کرنے سے مُراد ہے اور
اُن ملکوں میں جہاں کہ آبادی صرف قوم اور ایک مذہب سے مرکب ہوتی
ہے۔ یہ قاعدہ بلاشبہ سب سے عمدہ ہے جو جاری کیا جا سکتا ہے۔ لیکن
میرے لارڈ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے۔ جہاں کہ ذات
کے اختلافات اب تک موجود ہیں۔ اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں
ہوئی ہیں۔ اور جہاں کہ مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں۔ اور
جہاں کی تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں
میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی ہے۔ مجھ کو یقین ہے
کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی
غرض سے الیکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے محض

تمدنی خیالات کی بہ نسبت زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔
جب تک قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان
کی سوشیل۔ پولٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا اور ان معاملات
میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بشتیر متعلق ہیں۔ ان کے
باشندوں پر اثر ڈالے گا۔ اُس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ
طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جا سکتا بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب
پر بالکل غالب آویگی۔ اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر جاری
کرنے کا جوابدہ سمجھیں گے۔ جن کے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات
بہ نسبت سابق کے اور بھی زیادہ سخت ہو جاویں گے۔ میرے لارڈ میں نے
اس معاملہ کی نسبت اسقدر تفصیل کے ساتھ اس امر کی تشریح کرنے
کی غرض سے گفتگو کی ہے کہ میں نے ریپریزنٹیٹو کے طریقہ کا سچا
حامی ہو کر کس وجہ سے اس مسودہ کے اِن احکام کی دلی تائید
کی ہے۔ جو الیکشن کے خالص طریقہ کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں
گورنمنٹ نے جو لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں کے ایک ثلث
ممبروں کے مقرر کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس سے
گورنمنٹ نے وہی تدبیر اختیار کی ہے۔ جو ہندوستانی رعایا کے
مختلف فرقوں کی طرف سے ممبروں کے تقرر میں اس قسم کی مناسب
اور اچھی مساوات قائم رکھنے سے جو الیکشن کے خالص قاعدہ کے ذریعہ
سے حاصل نہ ہوگی لوکل سیلف گورنمنٹ کی کامیابی کی کفالت کے واسطے

اختیار کی جاسکتی ہے "۔

پھر تیسرے مہینہ جب کہ مارچ میں ضابطہ فوجداری کی ترمیم (البرٹ بل) پیش تھی۔ اینگلو انڈین اور یورپین طبقات کا اصرار تھا کہ ان کے مقدمات کی سماعت ہندوستانی مجسٹریٹوں کے اجلاس میں نہ ہو اور اس اصرار پر ایک ہنگامہ برپا تھا تو سر سید نے اس اصرار کے خلاف نہایت زبردست تقریر کی اور آخر میں کہا کہ :۔

"مجھ کو یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا۔ اُس وقت تک دونوں قوموں کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم رہیں گی۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت پولیٹیکل ہمسری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے اور ایک ہی عدالتوں کے تابع رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا۔ اگر زمانہ قدیم کے مقنن برہمن کے واسطے ایک قانون اور شودر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے گو زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن میرے لارڈ میں اُمید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گذر جانے سے ہم اب شائستگی کے اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں۔ جبکہ قومی امتیازات کو بہر کیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے۔ میرے لارڈ مجھ کو اپنی طرف سے تو یہ مستحکم یقین ہے کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے۔ جب کہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ یوروپین ہوں یا یوریشین۔ اس بات کو سمجھنے لگے کہ وہ ہمسر رعایا ہیں۔ اور ان

کے پولیٹکل حقوق یا کانسٹیٹوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے تحت میں حفاظت کا استحقاق جو ان کو حاصل ہے۔ وہ کچھ اُن کی قوم یا اُن کے مذہب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اُس بڑے حق کے سبب سے ہے۔ جن میں سب شریک ہیں یعنی اُس جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار رعایا ہونے کے حق کے سبب سے جس کے عہد دولت مہد نے ہندوستان کو امن اور آسائش بخشا ہے اور اُس کو تجارتی اولو العزمی اور شائستگی کے ہمراہ رفتوں کے اکتساب کے واسطے ایک مقام بنا دیا ہے۔ میرے لارڈ چونکہ یہ موقع غالباً اخیر موقع ہے جو قانونی کونسل سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے کا مجھ کو حاصل ہے۔ اسلئے میں ایسی گفتگو کو بغیر کہے اس بات کے ختم نہیں کر سکتا۔ کہ حضور کا عہدِ حکومت اس بات پر دل سے مبارکبادی کا مستحق ہے کہ اس میں ایک ایسا مسودہ قانون پیش کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ سے میں یقین کرتا ہوں کہ حسد انگیز قومی امتیازات بہت کچھ دور ہو جاویں گے اور آخرکار حکام اور محکوم کے درمیان اس ملک میں جس میں بہت سی قومیں مختلف مذاہب کی رہتی ہیں۔ دوستی اور باہمی ادب اور ہمدردی کو ترقی ہو گی۔

اس زمانہ میں جب کہ سرسید کی گہری توجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور جدید تعلیم سے تعصب و نفرت دور کرنے پر مبذول تھی ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ پریسیڈنسیوں کے معدودے چند مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے لیکن دو سال کے اندر جو کانگریس کا لٹریچر شائع ہوا وہ نہایت اشتعال انگیز

تھا۔ حکومت و حکام کو ظالم و بے رحم اور اپنے افعال کے نتائج سے بے خبر اور لاپرواہ بیان کیا گیا تھا۔ جن مصائب کے آتشین سمندر سے کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو گزرنا پڑا تھا۔ ان کی یاد ابھی تازہ تھی۔ جو ہولناک انتقام ان سے لیا گیا اس کا زخم ہنوز مندمل نہ ہوا تھا۔ پھر چودہ سال قبل ہی ۱۸۷۱ء میں وہابی تحریک کی بنا پر جو محض وہم پر مبنی تھی، مسلمان جاگیرداروں، امین داروں کی تمام املاک جو وسعت میں تمام بنگال کی ایک چوتھائی تھی۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے ضبط کرلی۔ اس پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہماری ملت کے سیکڑوں شریف اور خوش حال خاندان نان شبینہ کو محتاج ہوگئے اور ہماری قوم کے ہزاروں افراد عالم بے کسی اور مفلسی میں دربدر پھرنے لگے۔ سیکڑوں گھرانوں نے شہر کو خیرباد کہہ کر دیہات میں سکونت اختیار کرلی اور کاشتکاری پر قناعت کی۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری قوم کا وہ طبقہ جو رہنماؤں کی ایک جماعت ہوتا اپنے افلاس اور فقدان اثر کی وجہ سے نہایت ابتر اور متبذل حالت میں ہے۔[51]

ان حالات میں سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکا اور انہوں نے دسمبر ۱۸۸۷ء اور مارچ ۱۸۸۸ء میں بمقام لکھنؤ و میرٹھ دو تقریریں کیں۔ مولانا محمد علی صدر اجلاس کانگریس ۱۹۲۳ء کے نزدیک امر مخالفت کی حقیقی وجہ نوعیت[52] یہ تھی کہ:۔

"اگرچہ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سید احمد خاں کی پبلک زندگی اپنی قوم کی ترقی کے مساعی ہی میں صرف ہوئی۔ تاہم وہ ویسے ہی اپنے

---

۵۱ سرعبدالرحیم پریسیڈنٹ اسمبلی خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۵ء۔

۵۲ مولانا محمد علی خطبہ صدارت کانگریس کوکناڈا ۱۹۲۳ء

ہندوستانی رہے جیسے مسلمان تھے۔ ان کی بہت سی تقریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے سرگرم محب وطن تھے۔ اور ان کا سینہ اتحاد ہند کے جذبہ محبت سے لبریز تھا۔ جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ وہ اس کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں سے ان کی کیسی گہری دوستی تھی۔ جو اس تعصب کی موجودگی میں قطعی ناممکن تھی۔ جس کا بعض وقت اُن پر الزام لگایا جاتا ہے یہ الزام بھی کسی طرح صحیح نہیں کہ وہ ہر زمانے کے لئے مسلمانوں کے سیاسیات میں حصہ لینے کے خلاف تھے اپنی اُن دو تقریروں میں جن کا میں نے ذکر کیا۔ اُنہوں نے جو کچھ دلائل بھی پیش کئے ہوں۔ اُن سے قطع نظر کرکے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے وہ صرف دو ہی دلیلیں پیش کرتے تھے جن کی بنا پر بظاہر خود سید احمد خاں کو بھی یقین تھا۔ کہ اُس وقت مسلمانوں کی شرکت کانگریس قطعی نامناسب تھی۔ وہ اس امر کو اچھی طرح اندازہ کرتے تھے کہ ان کے زمانے کے مسلمانوں کی طبیعت و مزاج کو اس سے زیادہ کوئی شغل و فعل نہ تھا۔ کہ وہ اپنے برطانوی غاصبین حکومت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں۔ اور وہ یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ یہ فعل جیسا آسان تھا ویسا ہی آخر کار کانگریس جیسی امن پسند سیاسی تحریک کی بقاو ترقی کے لئے بہت ہی خطرناک ثابت ہوگا۔ یہ پہلی دلیل تھی جس نے سید احمد خاں کو مجبور کیا کہ اپنی قوم کو سیاسیات میں خاص حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں۔

دوسری دلیل بھی کچھ کم مضبوط نہ تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ مسلمان اگر

اپنی ترقی چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے اشاعت تعلیم میں کوشش کرنی چاہیئے۔ اور مغربی تعلیم کے حصول کے لئے مسلمانوں کو راضی کر لینا آسان نہ تھا۔ خواہ اپنی اس درسگاہ میں ہی کیوں نہ ہوں جس میں بہ خلاف سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے مذہبی تعلیم بھی دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دی جاتی ہو" مسلمانوں کے لئے یہ آسان تر تھا کہ قابل نفرت حکومت کافرہ کی تخریبی نکتہ چینی کے مزے لیتے رہیں بہ مقابلہ اسکے کہ ماہرین تعلیم کے خشک و بے مزہ تعمیری پروگرام سے دلچسپی لیں۔ لہذا سید احمد خاں نے اپنی تمام تر توجہ اس پر صرف کردی۔ کہ مسلمانوں کے مساعی کو سیاسی راستے کی طرف رخ کرنے سے روکیں جو زیادہ دلکش لیکن ساتھ ہی اس کے کم سود مند تھا۔"

پچھلی نسل کے اعمال وافعال پر نظر ڈالتے ہوئے۔ آج جبکہ وقوع واقعہ کے بعد عقلمند بننا زیادہ آسان ہے۔ سید احمد خاں کا یہ طرز عمل میری رائے میں نہایت دانشمندی پر مبنی تھا۔ اور اگرچہ میرا جی چاہتا ہے کہ بعض باتیں جو ان کی زبان سے نکل گئیں۔ کاش کہ وہ نہ کہتے۔ تاہم میں اس اعتراف پر مجبور ہوں کہ مسلمانوں کا یا بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کا کوئی خیر طلب مسلمانان ہند کی رہنمائی کے لئے بغیر اس کے اور کوئی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا لہذا یہ بھی پیش نظر رہے کہ جس شخص نے مسلمانوں کا مفاد اسی میں سمجھا کہ وہ نظر بہ حالات موجودہ کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ وہ شخص مسلمانوں کے حصہ غالب کا محبوب نہ تھا۔ سید احمد خاں چونکہ تعلیمات قرآنی کی تفسیر

عقل انسانی کے مطابق کرتے اور اُن عام پسند دہمیات کے شدت سے
مخالف تھے جو راسخ العقیدہ مسلمانوں میں مسلّمات مذہبی سمجھی جاتی تھیں
اور نیز اُن رسوم و روایات کے بیخ کنی میں مصروف رہے جو "ٹھیٹ اسلام"
کی نظر میں تو مستند نہ تھیں مگر جنہیں مرورِ ایام نے مذہبی شان دے رکھی
تھی۔ اسلئے انہیں ملحد و کافر قرار دیا گیا۔ لکھوکہا مسلمان انھیں سخت
سُست کہتے بلکہ سب و شتم کرتے اور مدّت دراز تک اس کالج کو جو
انہوں نے علیگڈھ میں قائم کیا تھا۔ ہوّا سمجھتے رہے۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا
نہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود الزام کفر و الحاد اور باوجود شدت سب
و شتم، سیاسی پالیسی میں ساری قوم کی قوم نے بے چون و چرا اسی شخص
کی پیروی کی ظاہر ہے کہ کسی منطقی مغالطہ یا سیاسی سبز باغ میں اتنی قوت
نہیں ہوسکتی اور میرا یقین ہے کہ سید احمد خاں کو محض اس وجہ سے کامیابی ہوئی
کہ ان کی سیاسی رائے صائب تھی۔"

اس کے بعد سرسید نے کسی مخالفت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ ۱۸۹۲ء کی اصلاحات،
نتیجہ میں جب کہ مسلمان ہر ادارہ میں نظر انداز کئے جاتے رہے تو ۱۸۹۶ء میں ایم
اے او ڈیفنس ایسوسی ایشن کے لئے جو ۱۸۹۳ء میں قایم ہوئی تھی آنریبل سید محمود
نے اس مسئلہ پر ایک یادداشت تیار کی کہ وہ موجودہ لیجسلیٹیف کونسل میں اس قسم کا
تغیر و تبدل کرا دیں جس سے ان کے ہم مذہب ممبروں کی کافی تعداد کو کونسل میں شریک
ہونے کا موقع ملے۔ اس یادداشت میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ :-

"ریپریزنٹیشن کا اصلی منشاء یہ ہوتا ہے کہ منتخب شدہ شخص انتخاب کرنے

والوں کو ریپریزینٹ کرے۔ موجودہ حالت میں لیجسلیٹو کونسل کے لئے بھی منتخب کرنے والے کثرت سے ہندو ہیں۔ پس اگر ہندوؤں کو قانوناً مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ممبروں کو منتخب کریں تو وہ مسلمان ممبر جن کو ہندو منتخب کرتے، وہ اپنے منتخب کرنے والوں ہی کی طرف سے ہوتے نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے۔ نفس الامر میں یہ بات ہر طرح قرین قیاس ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کی طرف سے ٹھیک ریپریزنٹیشن نہ ہوگا۔ کیوں کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد میں سے ہزارہا اشخاص ایسے ہوں گے۔ جو مختلف پولیٹیکل رائے رکھتے ہوں۔ اور ہندو انتخاب کرنے والے اگر وہ کافی عقل رکھتے ہوں گے۔ تو وہ انہیں مسلمانوں کو منتخب کریں گے۔ جن کے خیالات اُن سے بالکل یا تقریباً ملتے جلتے ہوں۔ اور اسطرح مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ اُن کے فرضی وکلاء جو درحقیقت ہندوؤں کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے ایک ایسی پالیسی کی کی تائید کر رہے ہیں۔ جس کو تمام مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔ اِس بات کی مثال ہم کو سینکڑوں دفعہ نیشنل کانگریس کی سلسلہ جنبانی سے ملی ہے جس نے یہ عجیب ترکیب اختیار کی ہے۔ کہ ایک مسلمان ممبر کو پریسیڈنٹ اجلاس بنایا جائے۔ گو کہ اِس موقعہ پر صرف وہ ہی ایک مسلمان ہال میں موجود ہو۔ اور اسکی لیاقت اور مرتبہ خود مسلمانوں میں ایسا نہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ اُسے کسی ایسے اجلاس کا پریسیڈنٹ بناتے۔ لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب میں اگر ہندوؤں کو مسلمان ممبر منتخب کرنے کے لئے مقرر کیا جاوے تو وہ ایک کانگریس والے مسلمان ممبر کو منتخب کریں گے اور مسلمان اس بات

کا خیال کرکے کہ ان کو کونسل میں ممبر ہونے کا افتخار حاصل ہو۔ دہو کہ کھا جائیں گے اور ایسی پالیسی کو ترک کر دیں گے جو ان کی جماعت کیلئے نہایت مفید ہے۔ انتخابی طریقہ کے ابتدائی اصول اس بات کو چاہتے ہیں کہ مسلمان ممبروں کے انتخاب کے لئے مسلمان ہوں۔ اور ہندو ممبروں کے انتخاب کے واسطے ہندو۔ ورنہ مسلمانوں کا ایسا ہی انتخاب ہوگا"۔

جیساکہ اسکاٹ لینڈ کے کیتھلک عیسائیوں کو پراٹسٹنٹ عیسائی منتخب کریں۔ اس کا انتظام نہایت آسانی سے یوں ہو سکتا ہے۔ کہ ایسا قاعدہ بنایا جائے جس کی روسے کسی خاص انتخاب میں میونسپلیٹوں کی ایک خاص جماعت کے ہندو میونسپل کمشنر کسی ہندو ممبر کو منتخب کرے۔ اور دوسرے انتخاب میں مسلمان میونسپل کمشنر کسی مسلمان ممبر کو یہی اصول امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں کے انتخاب میں اختیار کرنا چاہیے"۔

مسلمان پولیٹکل لحاظ سے ایسی جماعت ہیں جن کے تاریخی حالات جنکے اغراض جن کی ملکی مصلحتیں اور مذہب بالکل جدا ہیں۔ یہ بات ظاہر اور روشن ہے۔ اور کوئی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ آیرلینڈ کی رومن کیتھلک اور پراٹسٹنٹ عیسائیوں میں اسقدر اختلاف نہیں جس قدر کہ مسلمان اور ہندوؤں میں ہے۔ اس بات کی کچھ حاجت نہیں کہ ہم ان کے تاریخی واقعات کا حوالہ دیں۔ ان کے اغراض کی نسبت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے صرف ایک کو مدنظر رکھنا چاہیے یعنی ان کو ملازمت میں ایک بڑا حصہ ملنا چاہیئے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی خواہش رکھتے ہیں۔ کہ ان کو جس قدر زیادہ ممکن ہو ملازمت میں حصہ ملے۔

انگلستان کے لبرل اور کنسرویٹو فریقوں کا اختلاف بمقابلہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندوؤں کے اختلاف اغراض کے ہیچ ہے ....

لیکن چوں کہ مسلمانوں کی زیادہ تر توجہ اشاعت و توسیع تعلیم ہی کی طرف تھی اس لئے مذکورہ بالا ایسوسی ایشن کو اپنی جد وجہد کا التوا ناگزیر ہو گیا۔

باب دوم

غدر کے بعد ہی ہندوؤں نے اُردو کو مٹانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کو غلامی کی یادگار تصور کیا اخبارات میں پروپاگنڈا کیا گیا اور سر رشتہ تعلیم پہ زور و اثر ڈالا گیا۔ مگر بار بار ناکامیوں کے بعد بالآخر بہار میں ہندو کامیاب ہو گئے پھر اس مخالفت کا گہوارہ صوبہ متحدہ ہوا۔ یہاں بھی ۱۹۰۰ء میں کامیابی ہو گئی۔ سرسید کے جانشین نواب محسن الملک نے احتجاجی کارروائیاں کیں۔ جن کے نتیجہ میں ایک حد تک اشک شوئی ہوئی۔ لیکن زخم بھی کاری تھا اب مسلمانوں میں سیاسی تنظیم کا جوش پیدا ہو گیا۔ نواب محسن الملک کے پے در پے مضامین مختلف مقامات میں نواب وقار الملک کے دوروں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے جلسوں میں ان کی تقریروں نے بالآخر مسلمانوں میں پولٹیکل ارگنائزیشن کے قیام کا ایک زبردست احساس پیدا کرا دیا۔ ہنوز کوئی تنظیم نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۰۵ء میں حکومت نے تقسیم بنگال کر کے دو صوبے بنا دیئے۔

جس سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو یک گونہ ترقی کا موقع پیدا ہو گیا۔ اور وہ مواقع اور منافع حاصل ہوئے جس سے بڑی حد تک انکو محرومی تھی ہندو بنگالیوں نے اسکے خلاف زبردست

ایجی ٹیشن کیا۔ بائیکاٹ کی تحریک سامنے آئی اور اگرچہ اس تقسیم کے متعلق مسلمانوں کی کوئی تحریک نہ تھی۔ لیکن وہ ہندو اور بالخصوص بنگالی ہندو کے غصہ[۱۵] کا نشانہ بن گئے۔ ہنوز ہندوستان کے مسلمانوں کی پولیٹکل آرگنائزیشن کی اور ہندوؤں میں بہ جماعت کانگریس تنسیخ تقسیم بنگال کی کوشش جاری تھیں کہ ۱۹۰۶ء کے آغاز میں سکریٹری آف اسٹیٹ کی تقریر سے جدید ریفارم کی امید قائم ہوئی، نواب محسن الملک نے حیرت انگیز تنظیم کے ساتھ گورنمنٹ میں اپنی قوم کے سیاسی مطالبات پیش کرنے کی کارروائی شروع کردی اور چند ہی مہینہ کے اندر تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور ضرورت شناس مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوگئے بہت سے مباحث کے بعد میموریل مرتب ہوا جو ایک نمائندہ وفد نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو گورنر جنرل ہند کے روبرو پیش کیا۔ میموریل میں بیان کیا گیا تھا کہ :-

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد از روئے مردم شماری ۱۹۰۱ء چھ کروڑ بیس لاکھ سے اوپر ہے۔ گویا ملک معظم کی قلمرو ہند کی کل آبادی کے ایک خمس اور ایک ربع کے درمیان ہے اور اگر آبادی کے اس وحشی اور غیر مہذب حصہ کو قلم انداز کردیا جائے جس کی تفصیل جنگلی اور وحشی فرقوں کے عنوان سے کی گئی ہے اور نیز اگر ان فرقوں کو شمار سے خارج کیا جاوے جو عام طور سے ہندوؤں کے گروہ میں شامل کئے جاتے ہیں مگر فی الحقیقت

---

۱۵ اس وفد کو کانگریس نے نہایت غصہ و غضب کی نظر سے دیکھا اس کو حکومت کا پروردہ کہا گیا۔ چونکہ یہ کارروائی نہایت عجلت اور صیغہ راز میں ہوئی تھی اور بجز خاص خاص لوگوں کے کسی کو علم نہ تھا اس لئے جو کچھ مخالفت میں کہا گیا اس کو مستند قرار دے لیا گیا، حکومت کو تو خود اس کو قبول کرنے میں تامل تھا بڑی کوشش اور خاص شرایط سے گورنر جنرل نے منظوری دی تھی۔ تفصیل کے لئے تذکرہ محسن ملاحظہ ہو۔

ہندو نہیں ہیں تو مسلمانوں کی نسبت بہ اعتبار شمار کے ہندوؤں کی کثیر جماعت کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ نظر بریں ہماری یہ عرض ہے کہ "ریپریزینٹیشن" (نیابت) اور قائم مقامی کا محدود یا وسیع جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ اسکی رو سے مسلمان جو بہ استثنائے روس یورپ کی ہر دولت عالیہ کی آبادی سے زیادہ ہیں۔ اس امر کا انصافاً استحقاق رکھتے ہیں کہ امور مملکت میں ان کی وقعت و اہمیت پورے طور سے تسلیم کیجائے۔ بلکہ ہم حضور کی اجازت سے اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اور اس امر پر زور دینا چاہتے ہیں کہ طریقۂ قائم مقامی (یعنی ریپریزینٹیشن) میں خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ اور تمام ان امور میں جو اُن کی وقعت وشان پر موثر ہوں مسلمانوں کو جو درجہ عطا کیا جائے وہ نہ صرف ان کی تعداد سے بلکہ اُن کی سیاسی حیثیت کی اہمیت و وقعت سے اور نیز سلطنت کی حفاظت میں جو اُن کا قیمتی حصہ ہے اُس سے بھی کافی نسبت رکھتا ہو اور شق آخر پر نظر ڈالتے وقت ہمیں حضور کی عنایت سے اُمید ہے کہ حضور اس امر کو بھی بلحوظ خاطر رکھیں گے کہ آج سے کچھ اوپر ایک ہی صدی پہلے مسلمانوں کا رُتبہ ہندوستان میں کیا تھا؟ جس کی یاد ظاہر ہے کہ اُن کے دل سے اب تک محو نہ ہوئی ہوگی"۔

....

ہندوستان کے مسلمانوں کو ابتک اپنے فرمانرواؤں کی حق پسندی اور عدل گستری پر جو اُن کے خصائص کا جزو اعظم ہے۔ اعتماد رہا ہے۔ اسی لئے اُنہوں نے اپنے حقوق و دعاوی کو اس طور پر پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ جو باعث تکدر سرکار ہو۔ اور ہماری تمنا ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنی اُسی پسندیدہ اور قدیم وضع پر قائم رہیں مگر مجبوری یہ آپڑی کہ بعض واقعات نے جو حال میں پیش آئے ہیں اور عام طور پر اور خصوصاً

نوجوان مسلمانوں میں ایک جوش پیدا کر دیا ہے۔ جس سے اندیشہ ہے کہ بعض صورتوں اور مجبوریوں میں وہ جوش حدِ اعتدال سے گذر جائے اور بزرگوں کا نیک مشورہ اور معتدل ہدایت جس کا وہ اب تک اتباع کرتے آئے ہیں اُن کے قلوب پر مؤثر نہ ہو سکے۔"

. . . .

ہمیں اُمید ہے کہ حضور والا ہمیں معاف فرمائیں گے اگر ہم بیش از بیش اس امر کا اظہار کریں کہ جو طریقہ نیابت و قائم مقامی رعایا کا یورپ میں رائج ہے۔ وہ اہل ہند کے لئے بالکل نیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے بعض دور اندیش افراد کا خیال ہے۔ کہ اس طریقہ کو ہندوستان کی موجودہ تمدنی مذہبی اور سیاسی حالت پر کامیابی کے ساتھ منطبق کرنے کے لئے نہایت حزم و احتیاط اور مآل اندیشی سے کام لینا پڑے گا جو اگر نہ لیا گیا تو منجملہ اور خرابیوں کے ایک بہت بڑی خرابی یہ پیش آئیگی کہ ہمارے قومی اغراض کا سیاہ و سفید ایک ایسی جماعت کے حوالہ ہو جائے گا جسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے تاہم ایسی حالت میں جبکہ ہمارے فرمانرواؤں نے اپنے قومی اصول اور قدیم رسوم و عادات کے لحاظ سے مناسب تصور فرمایا ہے۔ کہ ان اصولوں کو ہمارے ملک کے نظم و نسق میں روز بروز زیادہ رواج دیا جائے ہم مسلمان اپنے قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر آئندہ اس پالیسی کی اغراض سے کنارہ کشی کسی طرح نہیں کر سکتے۔"

. . . .

لہذا ضرور ہے کہ اول ہم اس احسان کا اعتراف کریں جو حضور نے اور گذشتہ جلیل القدر وائسراؤں اور لوکل گورنمنٹوں کے اعلیٰ حکام نے اس بارہ میں ہم مسلمانوں پر محض اپنی منصف مزاجی و حق پسندی سے کیا ہے چنانچہ لیجسلیٹو کونسلوں میں مسلمان

ممبر بہت قلیل استثناء کے ساتھ گورنمنٹ ہی کی طرف سے نامزد ہوتے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عرض کرنا بھی ضرور ہے کہ جو حصہ قائم مقامی اور نیابت کا ہمیں عطا ہوتا رہا ہے وہ ہماری ضروریات کے مقابلہ میں ناکافی تھا۔ اسکے علاوہ جو لوگ کونسلوں کی ممبری کے لئے منتخب ہوئے وہ اُس گروہ میں ہمیشہ مقبول نہ تھے جن کے اغراض کی حمایت کے لئے ان کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ اور غالباً موجودہ حالت کے لحاظ سے کوئی دوسری صورت ممکن بھی نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو ان ممبروں کی تعداد جن کی نامزدگی حضور وائسرائے یا لوکل گورنمنٹوں کے اختیار میں تھی بالکل محدود تھی اور دوسرے ایسی حالت میں جبکہ عام لوگوں کی مرضی اور پسند کے دریافت کرنے کا کوئی صحیح عملی طریقہ موجود نہ تھا۔ ایسے اشخاص کا منتخب ہونا نہایت دشوار امر تھا۔ جو مقبول خاص و عام مسلمانان ثابت ہوں الیکشن کے نتائج کی حالت یہ ہے کہ موجودہ قاعدوں کی رو سے یہ امر بعید از قیاس ہے کہ اُن جماعتوں کی طرف سے جن کو انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے کسی مسلمان کا نام انتخاب کے لئے پیش کیا جائے تاوقتیکہ وہ اہم معاملات میں مجارٹی کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہمارے ہندو ہموطنوں کی یہ خواہش قابل اعتراض نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی قوت سے پورا فائدہ اُٹھا کر کہ صرف اپنی قوم کے افراد کے حق میں ووٹ دیں۔ یا غیر قوم کے ایسے کسی فرد کے حق میں جس کی نسبت یقین ہو کہ وہ ہندوؤں کی کثیر جماعت کی خواہش کے موافق رائے دیا کریگا۔ اور اُس کے بغیر اس کو چارہ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ آئندہ دوبارہ انتخاب اُس کا ہندوؤں کی رضامندی پر موقوف ہوگا یہ سچ ہے کہ ہمارے اور ہمارے ہندو بھائیوں کے بہت سے اغراض و مصالح مشترک ہیں۔ اور ہمارے لئے ہمیشہ یہ امر نہایت اطمینان

ومسرت کا باعث ہوگا کہ لیجسلیٹو کونسلوں میں قابل اصحاب بلالحاظ مذہب وملت ان اغراض ومصالح کی حمایت کے لئے موجود ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قومی حیثیت سے ہم مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہے۔ جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے۔ اور ہمارے بعض اغراض ومصالح ایسے بھی ہیں۔ جن کا تعلق بلا مشارکت غیرے ہماری ذات سے ہے۔ اور جن میں کسی دوسری قوم کو دخل نہیں ہے۔ اور چونکہ ان کی حفاظت وحمایت اس وقت تک پورے طور پر نہیں کی گئی۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو نقصان پہونچا ہے۔ حتیٰ کہ اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد بلحاظ آبادی بہت زیادہ ہے۔ وہاں اُن کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیا گیا کہ گویا پولیٹیکل لحاظ سے وہ بالکل بے وقعت ہیں۔ اور گویا داعیہ انصاف اِن کے ساتھ بے اعتنائی کئے جانے کا مانع نہیں ہے۔ پنجاب میں ایک حد تک یہی حال رہا ہے۔ مگر سندھ اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔

انتخاب وکلا کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے ہم بادب یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ کسی قوم کی پولیٹیکل وقعت کا بڑھنا یا گھٹنا زیادہ تر اُس قوم کے اُن ارکان کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے۔ جو سرکاری ملازمت میں داخل ہیں۔ اگر بدقسمتی سے کسی قوم کی تعداد جیسی کہ مسلمانوں کی حالت ہے۔ سرکاری ملازمت میں قلیل ہو۔ تو اس قوم کی جائز وقعت اور اصلی سیاسی اثر کو نقصان پہونچتا ہے۔ لہٰذا ہماری سب سے پہلی التجا یہ ہے کہ گورنمنٹ از راہ نوازش یہ انتظام فرمائے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں خدمات مندرجہ گزٹ ونیز خدمات ذیلی وخدمات متعلقہ دفاتر وغیرہ پر ہمیشہ ایک مناسب نسبت کے ساتھ مسلمانوں کا تقرر

کیا جائے۔ اگرچہ اس قسم کے احکام بعض صوبوں میں لوکل گورنمنٹوں نے گاہ بگاہ شائع کیے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کا نفاذ کبھی بتقلید عمل میں نہیں آیا۔ جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ قابل مسلمان نہیں ملتے۔ یہ بیان ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں صحیح ہو۔ مگر ہم کو اُمید ہے کہ آج کل یہ عذر ہرگز درست متصور نہ ہوگا۔ اور ہم حضور کو بمسرت تمام یقین دلا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد مانگ سے ہرگز کم نہ پائی جائیگی اگر حکام متعلقہ اُن کے لینے سے منکر نہ ہوں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جب سے لایق اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی درخواستیں صرف اس بنا پر رد کردی جانے لگی ہیں کہ اُن اشخاص کا حق مرجح سمجھا جائیگا جو بالاضافہ اُنسے زیادہ لایق ہوں۔ اِس طرح پر گویا کہ اُصول مقابلہ کی تدبیریں نشکل کو ملک میں رواج دیا جاتا ہے۔ لہذا ہم نہایت ادب سے حضور والا کی توجہ اُن پولٹیکل قباحتوں کی طرف مائل کرتے ہیں۔ جو ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں یعنی یہ کہ عمل مذکور سے وہ اثر و رسوخ و وقعت جو ملازمت سرکار سے حاصل ہوتی ہے ایک ہی فریق کا حصہ ہو جاتا ہے اِس سلسلہ میں ہم یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ حامیان تعلیم نے مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کے آغاز ہی سے اس کے لئے سخت کوشش کی ہے۔ کہ اخلاقی تربیت کا بہت زیادہ لحاظ رکھا جائے اور ہمارے خیال میں اعلیٰ اخلاق کی درستی سرکاری ملازمین کے لئے زیادہ ضرورت ہے۔ بہ نسبت بیش از ضرورت علمی قابلیت کے ہم اس امر کے عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ عام طور پر ہندوستان کے تمام مسلمان اس بات سے آزردہ خاطر ہیں کہ ہائیکورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان جج بہت کم مقرر کئے جاتے ہیں۔ جب سے یہ عدالتیں

قائم ہوئی ہیں۔ صرف تین مسلمان اس معزز خدمت پر مقرر کیے گئے ہیں۔ اور انہوں نے نمایاں طور پر اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل ثابت کیا اس وقت ان عدالتوں میں سے ایک میں بھی کوئی مسلمان جج نظر نہیں آتا۔ حالانکہ بنگال کے ہائی کورٹ میں تین ہندو جج ہیں۔ جہاں کہ مسلمان آبادی کا ایک بہت بڑا جزو ہیں اور پنجاب کے چیف کورٹ میں جہاں کی مردم شماری کا جزو غالب مسلمان ہیں۔ دو ہندو جج مقرر ہیں اور تمام ہندوستان میں اس وقت دیکھا جائے تو مختلف ہائیکورٹوں اور پنجاب کے چیف کورٹ میں ملکر آٹھ ہندو جج مقرر ہیں۔ اسلئے مسلمانوں کی یہہ درخواست ناقابل پذیرائی نہیں ہے کہ ہر ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں ایک مسلمان جج مقرر کیا جایا کرے۔ قابل مسلمان وکیل اور قانون داں ان عہدوں کے لئے بخوبی مل سکتے ہیں۔ جو اگر ایک صوبہ میں نہیں تو دوسرے صوبہ سے ضرور دستیاب ہو سکتے ہیں۔ علاوہ بریں ہر ہائی کورٹ میں ایک مسلمان جج کے ہونے سے جو مسلمانوں کی شرع سے واقف ہو۔ انصاف وعدالت گستری میں مدد ملے گی۔

چونکہ تمام اہم مقامی معاملات کا تعلق میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے ہوتا ہے۔ جس کا اثر بہت کچھ وہاں کے باشندوں کی صحت اور راحت اور ضروریات تعلیمی بلکہ فرائض مذہبی پر پڑتا ہے۔ اس لئے ہمیں اُمید ہے کہ حضور ہمیں معاف فرمائیں گے۔ اگر اہم معاملات پر بحث کرنے سے پہلے ہم حضور کی توجہ تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کی اُس حیثیت کی طرف منعطف کریں جو انہیں ان مجالس میں حاصل ہے۔ یہ مجالس سیلف گورنمنٹ کا ابتدائی زینہ ہیں۔ اور یہیں سے طریقہ نیابت و قائم مقامی کے اُصول پورے طور پر لوگوں کے دل نشین ہوتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی حیثیت ان مجالس میں

بھی کسی ایسے مقررہ اصول پر مبنی نہیں ہے جن کا عمل درآمد ہر جگہ ہو سکے۔ کیونکہ مختلف مقامات میں مختلف قواعد کی پابندی کی جاتی ہے۔ مثلاً علی گڈھ کی میونسپلٹی چھ محلوں پر منقسم ہے۔ اور ہر محلہ سے ایک ہندو اور ایک مسلمان ممبر منتخب ہوتا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ یہی اصول پنجاب اور دوسری جگہوں کی بعض اور میونسپلیٹیوں میں بھی رائج ہے۔ لیکن بہت سے مقامات میں مسلمان ممبروں کی تعداد جس قدر کہ ہونی چاہیئے منتخب نہیں ہوتی۔ اسلیئے ہم نہایت ادب سے التماس کرتے ہیں کہ مقامی حکام کو ہدایت کی جائے کہ ہر جگہ پر مسلمان اور ہندو ممبروں کی تعداد جس نسبت سے وہاں کی میونسپل اور لوکل بورڈز میں ہونی چاہیئے۔ صاف طور سے بتائی جائے۔ اور ہر قوم کے ممبروں کی نسبت کا تعین اُس قوم کی مردم شماری اور ممبروں کی ذاتی حیثیت و وقعت اور مقامی اثر اور ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے۔ جب اس امر کا تعین کیا جا چکے کہ ہر قوم کے اسقدر ارکان کو ممبری کا استحقاق ہوگا تو ہماری رائے میں مناسب ہوگا کہ ہر قوم کو اپنے اپنے وکلاء کے منتخب کرنے کی اجازت دی جائے۔ جیسا کہ پنجاب کے اکثر شہروں میں عمل درآمد ہے!

ہماری یہ بھی عرض ہے۔ کہ حتیٰ الامکان یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹوں اور سنیٹوں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر حکماً اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ ان مجالس میں مسلمانوں کی تعداد بہ مقابلہ دوسری اقوام کے اس قدر ہوگی۔

ہم اب اپنی رائے اس بارہ میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ملک کی لیجسلیٹیو کونسلوں میں ہمارا حصہ کس قدر ہونا چاہیئے۔ اول ہم پراونشل کونسلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اسکے متعلق ہماری گذارش یہ ہے کہ جس طرح میونسپل کمیٹیوں اور لوکل بورڈوں میں مسلمان ممبروں کی

تعداد کا تعین کیا جائے۔ اسی طرح یہاں بھی تعداد مقرر کردی جائے۔ اُن تمام اُمور کا پورا لحاظ رکھ کر جن کا ذکر ہم نے اس عرضداشت کی دفعہ (۵) میں کیا ہے اور ممبر برآوردہ مُسلمان جاگیرداروں تعلقداروں، زمینداروں، تجارتوں اور بڑے بڑے شہروں کے مُعزز باشندوں میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلمان ممبروں اور یونیورسٹیوں کے مُسلمان رجسٹرڈ گریجویٹوں کو جن کو پاس کئے ہوئے کچھ عرصہ مثلاً پانچ سال گذر چکے ہوں۔ حق انتخاب عطا کیا جائے۔ اور اُن کو اختیار دیا جائے کہ اُن قواعد کی رُو سے جو حضور اس بارہ میں نافذ فرمائیں۔ اُس قدر تعداد مُسلمان ممبروں کی منتخب کریں جو قرار پا چکی ہو۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے متعلق جہاں مُسلمانوں کی اغراض کی حفاظت اور حمایت کے لئے کافی تعداد مُسلمان ممبروں کی ہونی نہایت ضروری اور بہت ہی اہم ہے۔ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ :۔

(۱) اس کونسل میں مُسلمان ممبروں کی تعداد اُن کی قوم کی مردم شماری کی نسبت سے نہ قرار دی جائے اور کسی صورت میں اُن کی تعداد اس قدر کم نہ ہو کہ اُن کا کوئی اثر ہی نہ پڑ سکے اور عدم وجود برابر ہو جائے۔

(۲) حتی الوسع طریقہ انتخاب کو طریقہ نامزدگی پر ترجیح دی جائے۔

(۳) مُسلمان ممبروں کے انتخاب کے لئے مسلمان جاگیرداروں۔ تعلقداروں زمینداروں۔ قانون دانوں۔ تجارتوں اور بڑے بڑے شہروں کے سربرآوردہ باشندوں کو (جن کی حیثیت کا تعین گورنمنٹ کی طرف سے ہوگا) اور پراونشل کونسل کے مُسلمان ممبروں اور یونیورسٹی کے مُسلمان فیلووں کو انتخاب کرنے کا حق دیا جائے۔ جو

اپنے اختیارات کو اُن قواعد کے موافق عمل میں لائیں۔ جو حضورِ والا اِس بارہ میں نافذ فرمائیں۔"

کچھ دِن سے ہم سُنتے ہیں کہ ایسا بھی خیال ہے کہ حضور والبسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل میں ایک یا زیادہ دیسی ممبر مقرر کئے جائیں۔ اگر ہندوستانیوں کو اِس قسم کی خدمات کا دِنیا مناسب خیال کیا جائے۔ تو ہم التجا کرتے ہیں کہ اس بارے میں مُسلمانوں کے حقوق نظرانداز نہ کئے جائیں۔ ہم یہ عرض کرنے کی جراُت کرتے ہیں کہ ملک میں ایک سے زیادہ مُسلمان ایسے مل سکیں گے۔ جو اِن خدمات کی عمدگی کے ساتھ انجام دہی کی قابلیت رکھتے ہوں۔"

. . . .

اِس ایڈرس کا گورنر جنرل نے حوصلہ افزا اور پُر امید جواب دیا اور اس میں یقین دلایا کہ ذو مُسلمانانِ ہند مطمئن رہ سکتے ہیں کہ جب تک میرا تعلق اِس ملک کے انتظامی ابواب سے باقی ہے ان کے قومی حقوق و مقاصد کا پورا لحاظ کیا جائے گا۔"

اسی سال بمقام ڈھاکہ مُسلم لیگ کی تاسیس ہوئی جس کے لئے گزشتہ چھ سال سے جد و جہد تھی اس کا ابتدائی نصب العین[1] مُسلمانوں کے سیاسی حقوق کی محافظت و ترقی اور حکومت کی وفاداری کے ساتھ ہمسایہ اقوام سے اتفاق و اتحاد تھا۔ مگر ہندوؤں

---

[1] سنہ ۱۹۱۳ء میں "ہندوستان میں بلحاظ حالات حکومت خود اختیاری" لیگ کے نصب العین کی ترقی ہوئی تا آن کہ سنہ ۱۹۳۲ء میں (۱) تمام جائز اور پُر امن ذرائع اور مسلمانوں کے لئے کافی اور حقیقی تحفظات کے ساتھ کامل ذمہ دار حکومت کا حصول (۲) مُسلمانانِ ہند کے مذہبی و سیاسی اور دیگر حقوق کی محافظت اور ان کی ترقی (۳) مُسلمانانِ ہند اور دیگر اقوام کے درمیان دوستی اور باہمدگر تعلقات کا بڑھانا (۴) ہندوستان کے اور دیگر ممالک کے مُسلمانوں میں برادرانہ تعلقات

کی ایک زبردست جماعت نے اِن حقوق کے خلاف زبردست جدوجہد کی اِدھر وزیرِ ہند لارڈ مارلے نے ۲۷ نومبر ۱۹۰۸ء کو جو ڈسپیچ حکومت ہند کے پاس ارسال کیا اس میں مسلم نمائندگی کے اُصول کو تسلیم کرتے ہوئے مخلوط انتخاب کا بھی ایک سسٹم پیش کیا۔

چند مسلمان سیاستمین بھی تحفظ نشست کے ساتھ مخلوط انتخاب کے حامی ہو گئے، جن کی تعداد بہت ہی قلیل تھی۔ نواب وقار الملک نے قوم کے اصرار سے اسی سلسلہ میں دو مضامین لکھے جس میں انہوں نے جُداگانہ انتخاب کے وجوہ اصرار کی وضاحت کی۔

پہلے مضمون میں اُنہوں نے لکھا کہ :۔

بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا مسئلہ کے متعلق اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی دو رائیں ہو رہی ہیں غلبہ رائے جس کو سوادِ اعظم کہنا چاہیئے یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشترک انتخاب میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ اور ایک چھوٹے سے گروہ کی رائے جن میں بہت کم حضرات شامل ہیں۔ اور جن میں ہمارے معزز اور محترم دوست سید علی امام صاحب بھی شریک ہیں۔ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشترک انتخاب سے بھی فائدہ حاصل کرنا چاہیئے جو معزز حضرات یہ رائے رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو مشترک انتخاب میں شریک ہونا چاہیئے وہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتفاق اور یکجہتی باقی رہے گی اور مسلمانوں کا کلیتہً مشترک انتخاب سے علیحدہ رہ جانا اُن کو اپنے ایک بہت بڑے معزز اور مقتدر ہمسایہ گروہ سے بالکل علیحدہ کر دے گا۔ اور دونوں گروہوں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ :۔ کا قیام واستحکام نصب العین ہو گی۔ کانگریس نے بھی نصب العین میں اسی طرح تدریجی ترقی کی ۱۸۸۸ سے ۱۹۰۵ تک صرف رفاہِ عام مطمحِ نظر تھا ۱۹۰۶ سے ۱۹۱۶ تک سیلف گورنمنٹ ۱۹۱۷ سے ۱۹۲۰ تک ہوم رول اور ۱۹۲۱ میں سوراج اور ۱۹۲۹ میں مکمل آزادی ہوا۔

میں بجائے محبت کے کشیدگی اور رفتہ رفتہ دشمنی پیدا ہو جائے گی۔ میں بھی اس کے متعلق یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی یہ پالیسی رکھنی چاہیئے کہ جس طرح ہمیشہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ویسا ہی آیندہ بھی برقرار رہنا چاہیئے اور بدوں اپنے پولٹیکل حقوق کو صدمہ پہونچائے ہوئے جہاں تک ممکن ہے یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ دونوں گروہ باہم شیر و شکر رہیں۔

مسلمانوں میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ جس شدومد سے حسن سلوک کی تاکید ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی اور مذہب و ملت میں ایسی تاکید نہیں ہے۔ ہمارے ہندو دوست ہمارے ہمسایہ ہیں، اور ہم کو اپنے مذہب کے مطابق اُن کے ساتھ کامل ہمدردی اور سلوک کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے اور چونکہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمان اگر مشترک انتخاب میں شریک ہوں گے تو اُن میں اور ہندوؤں میں جھگڑے اور قضیے پیدا ہونگے۔ اور ہمارے قدیمی تعلقات میں اُن کی وجہ سے خرابی پیدا ہوگی۔ لہٰذا میں مشترک انتخاب میں مسلمانوں کو شریک ہونے کی صلاح نہیں دے سکتا۔

مسلمانوں کا مشترک انتخاب میں شریک ہونا مسلمانوں کے لئے ضرور مُضر ہوگا۔ ہمارے لئے صلاح وقت یہی ہے کہ مشترک انتخاب سے علیحدہ رہیں اور جو کچھ ہم کو گورنمنٹ علیحدہ ہمارے انتخاب کے ذریعہ سے دے۔ اُسی پر قانع رہیں۔ اور اگر سمجھیں کہ اُس میں ہماری پوری دادرسی نہیں ہوئی ہے تو لگاتار اپنی عذرات کو ادب اور اعتدال کے ساتھ گورنمنٹ میں پیش کرتے رہیں۔ اور یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر ہماری معروضات واجبی ہوں گی تو آج نہیں کل، اور کل نہیں پرسوں، ایک

نہ ایک دن ضرور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور جدید ریفارم اسکیم جاری ہوتے وقت اگر ہمارا پورا حق ہم کو نہ ملے اور اس میں کسی قدر کسر رہ جاوے تو اس سے بددل اور مایوس نہ ہونا چاہیئے اور مودبانہ کوشش کو جاری رکھنا چاہیئے؛

اب اس مسئلہ کو ایک دوسری نگاہ سے بھی دیکھنا چاہیئے۔ مشترک انتخاب میں ہمنے اپنے آپکو شریک کیا تو آیا ہم کو اس میں کوئی کامیابی ہوگی؛ میں نہایت زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ ناکامیابی یقینی ہے اور ذلت ورسوائی مزید برآں مشترک انتخاب کے وقت ظاہر ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ مجارٹی ہندوؤں کی ہوگی۔ ہم کتنی ہی دوڑ دھوپ کریں اور جن کے سامنے ہم کبھی اپنی ذاتی حاجت پیش کرنا نہ چاہتے تھے اُن کے دروازے پر بار بار دوڑے جاویں اور ہمارے کارندے اور عزیز اُن کی منت وخوشامد کریں مگر ہم ہندوؤں کی مجارٹی پر غالب نہ آسکیں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ناکامیاب ہوں گے اور دست گدائی دراز کرنے کی ذلت ورسوائی جو حاصل ہوگی وہ اس پر مستزاد۔

اور اگر کسی مقام پر کوئی کامیابی ہوئی بھی تو وہ ہماری کوششوں کی وجہ سے نہ ہوگی۔ بلکہ وہ دوسرے غالب گروہ کی محض مہربانی کی وجہ سے ہوگی جس کی نسبت کیا خوب کہا گیا ہے ؎

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است

رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

اور پھر وہ مہربانی معلوم نہیں کہ کس قسم کے معاوضوں اور اقراروں پر مبنی ہوگی اور اس کے بدل میں کس کس مضمون کے خطوط غلامی تحریر ہوں گے اور کس کس قسم کے اقرار

کئے جاویں گے ۔ اب ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ نیشنل کانگریس بعض مسلمانوں کو اپنی پریسیڈنسی کے عہدہ تک بھی سرفراز فرمانی ہے۔ لیکن پھر کیا وہ مسلمان بزرگوار مسلمانوں کے کسی کام کے ہوتے ہیں، ہمارے وہ ایک دفتری کام کے بھی نہیں ہوتے اس طرح اگر اپنی قوم کی اور اپنے قومی حقوق کی قربانی کر کے کسی نے کوئی ممبری حاصل بھی کی تو ایسی ممبری اُنہیں کو مبارک رہے ۔ قوم کو اُن سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ ایسے ممبر قوم کے حق میں بعض اوقات سخت مضرت کا موجب ہوں گے۔ کیونکہ جب وہ ظاہر میں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ کونسل میں نشست کریں اور ووٹ وہ دیں جو مسلمانوں کے قومی حقوق کو پامال کرنے والا ہو تو ایسے ووٹوں سے مسلمانوں کو بہ نسبت خالص ہندو صاحبوں کے بہت زیادہ نقصان پہونچ جاوے گا۔

جن مقامات میں مردم شماری میں مسلمان بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہیں۔کیا وہاں ہم ہندوؤں سے بازی لے جاویں گے۔ آج کے زمانہ میں تو یہ خیال بھی قریباً قریباً صحیح ثابت ہونا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں کوئی فوج اپنی کثرت تعداد کے لحاظ سے غلبہ نہیں پا سکتی۔ آج فتح حاصل کرنے کے لئے عمدہ ترین اسلحہ اور سامان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور اس زمانہ کی سلاح جنگ میں اعلیٰ تعلیم ہے۔ دولت ہے ۔ پولیٹیکل قوت اور اتحاد ہے ۔ اور جد و جہد ہے اور ان سب باتوں میں ہم اپنے دوسرے گروہ سے بہت زیادہ کم ہیں لہٰذا کوئی اُمید نہیں کہ صرف ہماری مردم شماری اُن مقامات میں بھی ہم کو کچھ مدد دے سکے ۔ مجھ سے صوبہ مشرقی بنگالہ کے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے مسلمان رئیس جو اس وقت ایک قانونی کونسل کے ممبر بھی ہیں ناقل تھے کہ وہاں ایک موضع کا زمیندار مسلمان تھا اور رعایا میں بھی مسلمانوں کی تعداد

غالب تھی - وہاں ایک ممبری کے لیے ایک مسلمان اور ایک ہندو اُمیدوار میں مقابلہ ہوا اِن زمیندار صاحب کی حالت یہ تھی کہ ان کا وکیل ہندو تھا - مہاجن ہندو تھا - اُن کا ذاتی خزانچی ہندو تھا - ڈاکٹر ہندو تھا - یہ سب مل کر زمیندار کے پاس گئے، اور اُن پر دباؤ ڈالا کہ آپ اپنا آدمی ہمارے ساتھ کر دیں تاکہ وہ آپ کی طرف سے تاکید کرکے آپ کی مسلمان رعایا کے ووٹ ہندو اُمیدوار کو دلادے اور مسلمان زمیندار سے اس وقت کچھ بن نہ پڑا - اور اپنے وکیل و مہاجن و ڈاکٹر کی فرمائش کی تعمیل کرنی پڑی اور ہندو اُمیدوار کامیاب ہوگیا - یہ اس صوبہ شرقی کی حالت ہے جہاں مسلمان کل آبادی میں تین ربع کے قریب ہیں، تا بدیگراں چہ رسد -

آخر میں میں پھر بہت زور سے یہی کہتا ہوں کہ مشترک انتخاب کے اکھاڑے میں مسلمانوں کو اُترنا نہیں چاہیئے - جہاں سوائے ناکامی اور ذلت و رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہوگا - اور مسلمانوں کو خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم کو اسی ملک میں رہنا ہے یہیں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے - ہندوؤں سے بگاڑ کر ہم کو راتوں کو آرام کی نیند سونا بھی میسّر نہ آسکے گا - شرقی بنگالہ ہی میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں - جہاں ہندو زمینداروں نے اپنی مسلمان رعایا کو جھوٹے مقدمات میں گرفتار مصیبت کرایا اور جب ناکردہ گناہ رعایا جیل خانہ میں گئی تو وہاں بنگالی جیلر نے اُن کی خبر لی یہ سب مظالم ہوتے رہے اور پولیس اُن کا کوئی تدارک نہ کرسکی - ہمارے اس ملک کی حالت ابھی

نوٹ :- یہ صاف تجربہ جانسی کے انتخاب ضمنی ۱۹۳۷ء میں بھی ہوا جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے نامزد اُمیدواروں کا مقابلہ تھا، ہندو زمینداروں نے مسلمان ووٹروں پر کانگریس اُمیدوار مسٹر نثار احمد خاں شیروانی کے لیے کافی دباؤ ڈالا -

خدانخواستہ اس حد تک نہیں پہونچی اور اس پر خدا کا شکر کرنا چاہیئے اور ایسی غلطیاں نہ کرنی چاہئیں جس میں ہمارے اور ہمارے ابنائے وطن ہندوؤں کے باہم رنج اور فساد کی آگ ہمیشہ مشتعل رہے اور ایک دوسرے کے دشمن بن جادیں۔

دوسرے مضمون کا اہم اقتباس حسب ذیل ہے:۔

گورنمنٹ کی پالیسی اب یہ ہے کہ کونسل ہائے قانون کی ممبریوں کے متعلق ایک حصہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے مشترک بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ دونوں گروہ صلح سے یا جنگ سے جس طرح مناسب سمجھیں۔ اپنی اپنی کامیابی کے لئے کوشش کریں۔ اس پالیسی سے گورنمنٹ کو ایک فائدہ تو یہ ہوگیا ہے کہ ہندوؤں کا کثیر گروہ جو گورنمنٹ سے یہ شکایت کرتا تھا کہ مسلمانوں کو مردم شماری سے زیادہ جو کچھ ان کی پولٹیکل عظمت کے لحاظ سے دینا تجویز کیا گیا وہ ان کے نزدیک خلاف انصاف ہے اب اس شکایت کے جواب میں بجائے اس کے کہ نہایت مضبوط اور صاف آواز سے کہہ دیا جاتا کہ گورنمنٹ کا یہ فیصلہ واقعات اور واجبیت پر مبنی ہے۔ اب ان شکایت کرنے والوں کو یہ کہہ کر مطمئن اور ساکت کر دیا جاوے گا کہ مسلمانوں کا وہ زائد حصہ اب تمھاری ہی مجارٹی کے اختیار میں ہے چاہے اُن کو دو یا نہ دو تم جانو اور تمھارا کام جانے۔

دوسرا پہلو گورنمنٹ کی پالیسی کا ایک وہ ہے جسکی نسبت بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے اشخاص اس پالیسی کی نسبت یہ بدگمانی کرتے ہیں کہ مشترک انتخاب کو قائم کرکے گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے دو بڑے گروہوں میں مخالفت کی بنیاد قائم کردی ہے تاکہ وہ دونوں باہم کسیوقت متحد نہ ہونے پاویں۔ کیونکہ اگر مسلمان اور ہندو اس ملک میں کسیوقت متحد اور متفق ہو جاویں تو جو کچھ ملکی حقوق ایک تعلیم یافتہ ملک کو اعلیٰ گورنمنٹ سے انصافاً ملنے واجبی ہیں۔

ان کو گورنمنٹ زیادہ عرصہ تک نہ روک سکے گی۔ یہ حالات کچھ نئے نہیں ہیں بہت مدت سے اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ اوائل میں تعلیم یافتہ گروہ میں اس سے اکثر اختلاف ہوتا تھا اور اب بھی جس کی تعلیم بہت اعلیٰ ہے اور جو گورنمنٹ کی ذمہ داریوں اور اسکے اعلیٰ فرائض سے بخوبی واقف ہیں اور جن کو خاص طور پر گورنمنٹ کے کاروبار میں شریک رہنے کا زیادہ موقع ملا ہے وہ قبول نہیں کرتے کہ گورنمنٹ ایسی تنگ دلی کی پالیسی اپنی رعایا کے متعلق اختیار کرے گی۔

خیر وجوہ کچھ ہی ہوں گورنمنٹ نے جب یہ پالیسی اختیار کرلی ہے کہ ملک میں ایک حصہ مشترک انتخاب کا بھی قایم رکھا جائے تو اب افسران گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ لازمی امر ہے کہ وہ کم از کم درپردہ اس بات کی سعی کریں کہ ہندو اور مسلمان دونوں مشترک انتخاب میں شریک ہوں، جہاں تک ہندوؤں کا اس سے تعلق ہے۔ وہاں تک چونکہ مجارٹی ان کی ہے۔ لہٰذا اُن کی نسبت مجارٹی کا لفظ ایک فرضی لفظ ہے دراصل جہاں تک اشتراک اور عدم اشتراک سے بحث ہوسکتی ہے وہ مسلمانوں ہی سے متعلق ہے مسلمان رؤسا اور اُمرا کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جنہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے یا ان کی خداداد دماغی قوت نے اُن کو ضروریات زمانہ سے بخوبی آگاہ کردیا ہے۔ اور وہ عزت کے اصل مفہوم کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور دوسرے پُرانی وضع قطع کے نئے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان میں سے اول الذکر تو گورنمنٹ سے صاف صاف ملک کی موجودہ حالتوں اور ضرورتوں کو بیان کرکے مشترک انتخاب سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھیں گے۔ مگر اس گروہ کی تعداد ابھی بہت کم ہے اور دوسرا گروہ جن کی تعداد بھی زیادہ ہے ان کو گورنمنٹ کے اعلیٰ افسران کے ایماء سے گریز کرنا ناممکن کے قریب

ہوگا اور گو وہ اپنے دل میں کیسا ہی پیچ و تاب کھائیں اور مشترکہ مقابلہ کی مشکلات اور اونے ادنے لوگوں کے سامنے التجا لے جانے کو وہ کیسا ہی معیوب اور اپنی قدیمی وضع کے خلاف سمجھیں لیکن طوعاً و کرہاً ان کو مشترکہ انتخاب میں شریک ہونا پڑے گا نتیجہ میں اگر وہ کامیاب ہوئے تو مختلف قسم کے ایسے اسباب پر مبنی ہوگا جس کو اول الذکر گروہ برداشت نہ کرسکتا تھا تو فبہا ورنہ گورنمنٹ دوسرے طریقہ سے اُن کی اشک شوئی کریگی اور ان کو عزتوں سے سرفراز کرے گی جن کو وہ گروہ غلطی سے عزت سمجھے ہوئے ہے اس دوسرے گروہ کی نسبت میں بلا تامل یہ کہوں گا کہ چاہے مقابلہ کے وقت ان کو کیسی ہی ندامت برداشت کرنی پڑی ہو لیکن ان کی خیر خواہی اور وفاداری میں جس کو گورنمنٹ خیر خواہی و وفاداری سمجھتی ہے۔ اس ناکامی کی وجہ سے کوئی فرق نہ آوے گا اور وہ گورنمنٹ کے ویسے ہی خیر خواہ و وفادار رہیں گے جیسے کہ پہلے تھے۔

لیکن اوّل الذکر تعلیم یافتہ مسلمان گروہ میں سے اگر کوئی مشترک انتخاب کا حامی بنا تو اس کی حالت بالکل دوسری ہوگی۔ امارت اور بڑی بڑی تعلقہ داریوں اور زمینداریوں سے قطع نظر کرکے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان گراجوٹیوں میں سے اگر کسی نے یہ رائے قائم کی کہ مشترک انتخاب میں حصہ لینا ملک کے لئے مفید ہے تو اس قسم کے اہل الرائے سے جو گروہ بنے گا وہ ایک ایسا گروہ ہوگا جس کی قوت کو آخر الامر گورنمنٹ اس خوشی اور اطمینان سے نہ دیکھ سکے گی۔ جس طرح کہ آج دیکھے گی۔ ایک تعلیم یافتہ شخص اپنی یہ رائے اسی وقت قائم کرے گا جب کہ یا تو وہ کانگریس کا مرید بن چکا ہے یا وہ ملکی محبت میں اس درجہ سرشار ہوگیا ہے جس نے قوم قوم کی صدا کو اپنے لئے موجب ننگ سمجھ لیا ہے اور "بندہ عشقشم واز ہر دو جہاں آزادم" اس کی رگ و پے میں سرایت کرچکا ہے۔

وہ صرف اس آزاد قوم کی آزادی چاہتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے گو کہ اس کی قوم پامال ہی کیوں نہ ہو جائے اس درجہ کے لوگ جن کو میں حد سے بڑھ جانے والا ملکی دیوانہ کہوں گا اور ان کی نیک نیتی کی وجہ سے اُن کی بہت ہی عزت کروں گا۔ ضرور مشترک انتخاب میں خوشی سے حصہ لیں گے اور ہندوؤں کے اکسٹریمیسٹ گروہ کے نشوونما کو میں گورنمنٹ کی اس غلط پالیسی کا نتیجہ قرار دوں گا۔ جو اس نے مشترکہ انتخاب کے قائم کرنے میں اختیار کی ہے۔

اسی طرح ایک اور اندیشہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان مشترک انتخاب میں بار بار زک پاویں گے اور ذلیل و خوار ہوں گے تو عجب نہیں جو کسی وقت وہ یہ سمجھ جاویں کہ یہ مشترک انتخاب کا کوئی محفوظ راستہ نہیں ہے جو گورمنٹ نے ہمارے لئے تیار کیا ہے۔ اور جس طرح لبا اوقات مایوسی بھی ایک ذریعہ کامیابی کا ہو جاتی ہے وہ اپس آپس کے جھگڑوں سے باز آویں اور باہم شیر و شکر بن کر بہ تعداد کثیر نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر دکھائی دینے لگیں، اور یاد رکھو کہ جو لوگ اس طرح پلٹا کھائیں گے۔ وہ ماڈریٹ پارٹی میں شامل نہ ہوں گے۔ بلکہ وہ سیدھے اکسٹریمیٹ پارٹی کا جزو ہو جائیں گے“

غرض ہندوستان میں مسلمانوں کی عام رائے جدا گانہ انتخاب کے متعلق نہایت سخت ہو گئی۔ اسی رائے کی تائید میں لندن مسلم لیگ کے ایک وفد نے بھی وزیر ہند کی خدمت میں احتجاج پیش کیا۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی نے جو اس وفد کے صدر تھے اپنی تقریر میں اس امر پر بہت زور دیا کہ مخلوط انتخاب میں ایسے مسلمان منتخب نہ ہو سکیں گے جو مسلم مفاد کی صحیح طور پر ترجمانی کریں، انہوں نے مسلمانوں کی قومی اہمیت اس کی تشکیل اور خاص حالت پر

زور دیتے ہوئے کہا کہ مخلوط انتخاب کا طریقہ مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ہوگا۔ ان کی نمایندگی دوسروں کی خواہش پر نہ ہو بلکہ آزادانہ ہو، اور اسی صورت میں وہ ان رعایات سے مستفید ہو سکتے ہیں جو ہندوستان کو دی جا رہی ہیں۔ وزیر ہند نے ہمدردانہ جواب میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ ڈسپیچ میں کہیں مخلوط انتخاب پر زور نہیں دیا گیا۔

اور پھر یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو نائب وزیر ہند نے دار العوام میں کہا کہ "ایسے لوگوں نے جو ہماری طرف سے کچھ کہنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں ان (مسلمانوں) سے پختہ وعدے کئے ہیں کہ انھیں اسی قدر اور اسی قسم کی نیابت دی جائے گی جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہوگی ...... ہم اس وعدہ سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے" اور نہ ہمیں ہٹنا چاہیئے اور نہ ہم پیچھے ہٹیں گے۔ مسٹر ایسکوئیتھ وزیر اعظم نے انڈیا بل کی دوسری خواندگی کے موقع پر انتخاب جداگانہ کے اسباب و علل پر اظہار خیال کر کے اس کو تسلیم کر لیا

باب سوم

تقسیم بنگال اور منٹو مارلے ریفارم اسکیم کے نفاذ سے (۱۹۰۵ تا ۱۱ء) ہندو سیاسین میں حکومت سے زیادہ مسلمان کے ساتھ نفرت و غصہ پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے فسادات ہوئے اور تعلیم یافتہ طبقات میں بھی کشمکش ہو گئی۔ آنریبل مسٹر گوکھلے نے جو اس وقت کے سیاسین میں زبردست شخصیت رکھتے تھے ۱۹۰۷ء میں باہمی اتحاد کے لئے ایک دورہ کیا۔ لکھنؤ اور علی گڈھ میں ان کی زبردست تقریریں ہوئیں۔ ایک تقریر میں انہوں نے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا کہ چونکہ مسلمانوں

کا گروہ تعداد میں ہندوؤں سے کم ہے۔ لہذا اُن کو خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت میں آجائیں یہ خیال ایسا نہیں کہ اس کو مذاق میں اُڑا دیا جائے۔ جو حالت بلحاظ مردم شماری وغیرہ اس وقت مسلمانوں کی ہے۔ اگر یہی حالت ہندوؤں کی ہوتی تو کیا عجب ہے کہ یہی اعتراض ہمارے دلوں میں خطور کرتا۔ اور ہم بھی اس خیال کو پیش نظر رکھتے اور اسی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہوتے جس پر کہ اس وقت مسلمان عمل کر رہے ہیں۔ نواب محسن الملک نے بھی ایک دعوت میں مسٹر گوکھلے کے جام صحت کی تجویز پر تائیدی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر اظہار خیالات کیا، اور مغربی تعلیم سے قبل ہندو مسلمانوں کی یگانگی اور اتحاد کے تذکرہ کے بعد کہا کہ :-

لیکن جب مغربی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے روز بروز اختلاف بلکہ مخالفت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور دوستی کی جگہ باہمی نفرت بڑھتی جاتی ہے۔ اتحاد اور ارتباط کی خوبی اور ضرورت پر بڑے بڑے لیکچر دئے جاتے ہیں، بہت پرجوش تقریریں کی جاتی ہیں مگر عملاً اختلاف دور کرنے اور اتحاد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جاتی ہیں نہیں سمجھتا کہ یہ مقصد فصیح و بلیغ لیکچروں کے دینے اور اتحاد و ارتباط کی خوبی پر زور تقریریں کرنے سے حاصل ہوگا جب تک کہنے والے خود ان باتوں کو دور نہ کریں جو باعث اختلاف اور ذریعہ مخالفت ہیں میں دیکھتا ہوں کہ جو غار ہندو اور مسلمانوں کے بیچ میں حائل ہے بعض نیک دل اور ملک دوست اس پر پل باندھنے اور اس کو ہموار کرنے کی ضرورت سمجھتے اور اس کے لئے نصیحت کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ روز بروز وہ غار نہ زیادہ گہرا زیادہ چوڑا ہوتا جاتا ہے زبان سے کہا جاتا ہے کہ اینٹ لاؤ چونہ

لاؤ" اور اس غار کو برابر کرو مگر ہاتھ میں پھاوڑے اور کدال ہیں اور بجائے بھرنے کے وہ غار اور وسیع اور عمیق کیا جاتا ہے"

پھر کہا کہ :-

"ان لوگوں کو جو درحقیقت اتحاد کے خواہاں ہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مہلک بیماری کا علاج زبان سے نہیں ہو سکتا بلکہ ہاتھ سے یہ اختلاف پلیٹ فارم پر فصیح و بلیغ لیکچر دینے سے دور نہیں ہو سکتا بلکہ وجوہ اختلاف پر غور کرنے، اور اس کے دفع کرنے کی تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہو سکتا ہے"

اس کے بعد اُنھوں نے تمثیلاً صوبہ متحدہ میں اُردو کے مٹانے کی جو کوششیں مدعیان اتحاد کی طرف سے ہو رہی تھیں اُن کو بیان کر کے کہا کہ :-

"اب فرمایئے کہ اگر اتحاد کے وعظ کہنے والے یہ چاہیں کہ ہم اُن کی کوشش کا مقابلہ نہ کریں اور اپنی زبان کے قائم رکھنے کے لئے بھی ان کے حملوں کو دفع نہ کریں اور اگر ایسا کریں تو ہم اتحاد کے دشمن اور مخالفت کے پیدا کرنے والے سمجھے جاویں تو اس میں قصور ہمارا یا ہمارے دوستوں کا ایسا اتحاد تو وہی شخص چاہے گا جو اپنی قومیت کی مخصوص علامت کے ترک کرنے کی پروا نہ کرے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اپنی قوم کو دوسری قوم میں جذب ہو جانے کو اتحاد سمجھے ہم اس کو اتحاد نہیں سمجھتے"

پھر دونوں اقوام میں نااتفاقی کی ترقی پذیر حالت کا بیان کر کے اتحاد کی تدبیر یہ بتلائی کہ :-

"ایسی حالت میں ایک دو نیک دل اور راست باز ہندو مسلمانوں کے روکنے اور سمجھانے سے کیا ہو سکتا ہے پھر جو لوگ سمجھاتے ہیں وہ دوسری قوم کو نہ اپنی قوم کو

حالانکہ سمجھانا چاہیے اپنی قوم کو اور ہر قوم کے لیڈر کو اپنا رسوخ اور اپنا اثر ڈالنا چاہیے اپنے ہی ہم قوم پر تاکہ اس کے دل پہ نصیحت کا اثر ہو اور اسکے سمجھانے سے کچھ فائدہ حاصل ہو مسلمان لیڈروں کو چاہیئے کہ وہ اپنی قوم کو ان باتوں کے کرنے سے رُکنے کی کوشش کریں جن میں ان کا کوئی بڑا مذہبی یا قومی نقصان نہ ہو اور جن کے کرنے سے ان کے ہموطن ہندو بھائیوں کو رنج ہوتا ہو اسی طرح ہندو لیڈروں پر لازم ہی کہ وہ اپنی قوم کو نصیحت کریں کہ جو کام اُن کے لیئے بہت سخت نقصان پہنچانے والے نہ ہوں اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ ہو اس میں مسلمانوں کی مدد کریں مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کہ مسلمان ہندوؤں کو اور ہندو مسلمانوں کو ہدایت اور نصیحت کریں اور صرف اپنے اپنے فائدوں ہی کا خیال رکھیں اس کا نمونہ ہز مجسٹی امیر کابل نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور ہندوؤں کی دل شکنی کے خیال سے گائے کی قربانی نہ کرنے کی نصیحت کی ہے۔ یہی اصلی اتحاد پیدا کر دینے کی صورت ہی اور دلی محبت قائم کرنے کی شکل ہے۔ کاش ہم لوگ اسے پیش نظر رکھیں اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا خیال کریں اور ایک دوسرے سے کچھ کچھ اپنے فوائد کا نقصان گوارا کریں"۔

آخر تقریر میں انھوں نے اپنا یقین ظاہر کیا کہ:۔

"باہمی اتحاد کی جو کوششیں مسٹر گوکھلے کرتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوں گی اور ہر ایک نیک دل مسلمان ان کی سچی کوششوں میں مدد دے گا اگر ہندو بھائی مسلمانوں کی طرف ایک انچ بڑھیں گے تو مسلمان دو گز بڑھ کر ان کا خیر مقدم کریں گے۔

۱۹۱۰ء میں حالات بہت نازک ہو گئے۔ اس سال کانگریس کی صدارت پر سر ڈبلیو ویڈربن کا انتخاب ہوا تھا۔ انھوں نے اور ہز ہائنس سر آغا خاں نے

انگلستان میں بھی ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا اور ایک اتحاد کانفرنس قائم کرنے کی تجویز کی، چنانچہ الہ آباد میں کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ ہندو مسلم زعمائے سیاست مجتمع ہوئے تقریریں ہوئیں اور مسائل متنازعہ پر غور و فیصلہ کے لئے ایک کمیٹی قائم ہو گئی۔ لیکن اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی سیاسی تنظیم پورے طور پر کرلی تھی مسلم لیگ روز بروز طاقتور اور زبردست ادارہ ہوتی جاتی تھی ۱۹۱۱ء میں دربار تاجپوشی کے موقع پر ہزامپیریل مجسٹی قیصر ہند نے جو تقریر فرمائی اس میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا بھی اعلان تھا۔ جس سے بنگالیوں میں تو جذبات مسرت و تشکر پیدا ہوئے مگر مسلمان افسردہ ہو گئے اور ایک غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس حالت پر نواب وقار الملک نے جنوری ۱۹۱۲ء کے علی گڈھ انسٹیٹوٹ میں جو پہلا مضمون لکھا اس میں قوم کو توجہ دلائی کہ "یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیے لاحاصل مشورہ ہے اب زمانہ ہر قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر ہم کو بھروسہ کرنا چاہیئے وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے۔"

اس مضمون کا تعلیم یافتہ طبقہ پر زبردست اثر ہوا۔ اگرچہ طرابلس و بلقان کے واقعات اور جنگ عظیم میں ٹرکی کی شرکت اور ہنگامہ کانپور (مسجد مچھلی بازار کے ایک حصہ کے انہدام) سے مسلمان انتہائی بے چین اور متردد تھے۔ مگر ہندوستان کی اندرونی سیاست پر بھی پورے طور پر توجہ تھی۔ ان کو کانگریس کے بہت سے مطالبات سے اتفاق تھا اور وہ نسلی حقوق ختم کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ فرزندان ہند کو انتظام ملک میں شرکت و دخل کا پورا حق اور موقع ملنا چاہیئے۔ وہ اپنی قومیت

کو ہندو قومیت میں جذب کئے بغیر اور اپنے مخصوص حقوق کے تحفظ کے ساتھ ملک کی آزادی کے خواہاں تھے۔

اس سلسلہ بیان میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۰۸ء سے پہلے "کانگریس کا مقصد آئینی ذرائع سے ہندوستان کے باشندوں کے مفاد اور فلاح کو ترقی دینا تھا" اور اس سال نو آبادیوں کے طرز کی گورنمنٹ" قرار پایا۔ کانگریس کے اکثر صدر نشین حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر بھی ممتاز ہوتے رہتے تھے[1]۔ ان کو خطابات بھی ملتے تھے۔ صدر نشیناں کانگریس کے صدارتی ایڈرسوں میں حکومت برطانیہ کے سامنے خراج عقیدت بھی پیش ہوتا رہتا تھا۔ مثلاً "اس سوراج کی روشنی اور آسمان کے تلے انگریزوں سے زیادہ دیانت دار، منصف مزاج اور توانا کوئی قوم آباد نہیں ہے" یا یہ کہ "ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتیں انگلستان کی دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں۔ اور اس عظیم کام میں اسکے ساتھ ہیں جو اس کے سامنے موجود ہے"۔ ۱۹۱۱ء کے شاہی اعلان تنسیخ بنگال سے جو جذبہ پیدا ہوا وہ مسٹر امبیکا چرن موزمدار کے الفاظ میں یہ تھا کہ ہر شخص کا دل برطانوی تاج کی وفاداری اور عزت کی خوشی میں رقص کر رہا ہے اور برطانوی سیاست کی انصاف پسندی سے لبریز ہے اور ہم

---

[1] بدرالدین طیب جی ہائیکورٹ کے جج منتخب کئے گئے۔ سر شنکران آر اگر بکلوکونسل گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر۔ سر ایس۔ پی سنہا لارڈ اور گورنر بہار مقرر کئے گئے۔ سر۔ سی۔ پی راما سوامی آئر جو کانگریس اور ہوم رول لیگ دونوں کے سکرٹری تھے بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے مثلاً سر سرینیدر ناتھ بنرجی بانی کانگریس اور بنگال کے لیے تاج کے بادشاہ وزیر بنگال ہوئے۔ کچھ مسلمان لیڈر بھی مسلم لیگ کے زینہ سے مدارج اعلیٰ پر فائز ہوئے جن میں سر وزیر حسن کا نام نہایت ممتاز ہے جو عرصہ تک لیگ کے پرجوش سیکرٹری تھے۔

بعض تاریک اور مایوس ترین ایام میں بھی برطانوی انصاف کے عقیدہ سے متزلزل نہیں ہوئے۔ یہی حالت مسلمانوں کی بھی تھی۔ لیکن جنگ عظیم کے جو اثرات اسلامی ممالک پر پڑے تھے۔ ان سے ان کا دل زخمی تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تنسیخ تقسیم بنگال کے بعد دلوں سے حکومت کا اعتبار بھی جاتا رہا۔ اسلئے اب لیگ کے اجلاسوں میں ایک خاص جوش تھا جو ۱۹۱۳ء کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں جو سر ابراہیم رحمۃ اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اور جس میں تمام بڑے بڑے مسلمان سیاسئین جمع تھے بڑے جوش سے سیلف گورنمنٹ کا رزولیوشن پاس ہوا۔ سر ابراہیم نے اپنے ایڈریس میں کہا کہ "ہندوستان ہمارا آبائی ملک ہے اور قابل قدر وراثت اور آخر کار ہمارے محافظین کو اسے ہمارے سپرد کرنا ہوگا۔ اور پھر تو لیگ کانگریس سے بھی چند قدم آگے تھی۔ اور کانگریس نے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ جب کبھی کوئی مطالبہ پیش ہوگا تو قلیل التعداد قوموں کے حقوق کا تحفظ کرے گی۔ تاآں کہ ریفارم کی دوسری قسط دینے کا وقت آگیا۔ مگر ہندوستانی سیاست اسی منزل میں تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر امید کا مطلع صاف ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اس امر کا زبردست احساس ہو گیا تھا کہ سیاسی نجات کا ذریعہ صرف ہندو مسلم اتحاد ہی ہے۔ اس لئے ۱۹۱۵ء میں دونوں قوموں کے سیاسئین نے اس راستہ کی جستجو کی۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمقام بمبئی کانگریس اور لیگ کے اجلاس منعقد ہوئے۔ کانگریس کے پریسیڈنٹ سر ایس۔ پی سنہا اور لیگ کے مسٹر مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ تھے۔ یہاں دونوں قوموں کے سیاسئین نے اتحاد کی تعمیر کے متعلق مشورے کئے اور ریفارم اسکیم کے متعلق غور کرنے کے لئے کمیٹی کی تشکیل ہو گئی۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں بمقام کلکتہ سر نیدرناتھ بنرجی کی صدارت

میں کانگریس اور لیگ کی مشترکہ میٹنگ ہوئی اور باہمی سمجھوتہ کے بعد ایک میثاق مرتب ہوا جو لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگریس کا اجلاس زیر صدارت مسٹر امبیکا چرن موزمدار اور مسلم لیگ کا زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا۔ ۲۶ دسمبر کو کانگریس نے اور ۳۱ دسمبر کو لیگ نے اس میثاق کی تصدیق کی۔ مسٹر جناح نے تصدیق کے لئے پیش ہونے سے پہلے اپنے ایڈریس میں کہا کہ :-

مسلمانوں پر تفرقہ پسندی کا غلط الزام

میں اپنی پبلک زندگی میں ہمیشہ پکا کانگریسی رہا ہوں۔ اور فرقہ دار شور و غل کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا جو الزام مسلمانوں کے سر تھوپا جاتا ہے۔ وہ نہایت نامناسب اور غیر متعلق ہے۔ جب کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ عظیم الشان قومی نظام سرعت کے ساتھ متحدہ ہندوستان کی پیدائش کا ایک طاقتور آلہ بنتا جاتا ہے۔ ایک قلیل تعداد جماعت کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کو اپنی حفاظت کا کامل اطمینان ہو قبل اسکے کہ قومی کاموں میں اس کے وسیع تر سیاسی احساس کو باہمی امداد اور متحدہ کوشش پر آمادہ کیا جاوے مسلمانان ہند کو یہ طمانیت بہ حیثیت ایک جماعت کے اپنی سیاسی ہستی کے کامل اور موثر تحفظ ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ میری ذاتی رائے جو کچھ بھی ہو لیکن یہاں میرا یہی فرض ہے کہ مسلمانوں کی کثیر التعداد جماعت کی رائے کی ترجمانی کروں۔ جس کا آل انڈیا مسلم لیگ سیاسی آلہ ہے۔

یہ امر میرے لئے اور ہر محب وطن کے لئے نہایت طمانیت بخش ہے۔ کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو ہندو جماعت کے لیڈروں نے تسلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ فراخ دلی کا برتاؤ کیا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی کمیٹیوں نے گذشتہ نومبر میں کلکتہ میں مل کر جو عہد اور متفقہ فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس کی بین دلیل ہے۔ دونوں فریقوں میں چند ایسے نفوس جن کا رضامند ہونا محال ہے اب بھی ممکن ہے کہ کہیں کہیں موجود ہوں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی فرقہ دارانہ ابر کے خوف سے مطلع صاف ہو گیا ہے۔ اور مستقبل کے مناظر ان علامات سے چمک اُٹھتے ہیں۔ جو ہندوستان کے وفادار فرزندان کے دل خوشی سے معمور کر دیتی ہے ...."

جُداگانہ اسلامی نیابت کا جھگڑا

جس طرح میں اپنی قوم کے اس رکن سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔ جو باوجود قومی ہستی کی توثیق کے اپنے ہندو بھائی کی طرف دست مودت نہیں بڑھاتا اسی طرح میں ہندو محب وطن کے رویہ کی بھی تعریف نہیں کر سکتا۔ جو اپنے ایک پونڈ گوشت پر مصر ہے۔ خواہ اس کشمکش میں کسی ایک فریق کے جزوی نفع کے لئے تمام ملک کا مستقبل ہمیشہ کے لئے برباد ہی کیوں نہ ہو جائے۔ مثال کے طور پر میں حال کے افسوسناک نزاع کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ جو میونسپل ایکٹ کے منظور ہو جانے کی وجہ سے پیدا کی گئی۔ لیکن یقیناً ہم میں سیاسی عقل و دانش کی کمی نہیں ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ خواہ ہم ہندو ہوں یا مسلمان کہ جدید ہندوستان کو بالکل دوسری

قسم کے قومی کارکنوں کی ضرورت ہے جو زیادہ فیاض دل اور فراخ حوصلہ ہوں۔ جو فرقہ کی انانیت اور تعصب کی تنگدلی سے مبرا و منزا ہوں۔ جو کمزور کو کچل ڈالنے کی خواہش کو دبا سکیں اور جو اس کے باوجود طاقتور کی چیرہ دستیوں کے سامنے ہمت نہ ہاریں۔ جو آجکل کے چھوٹے چھوٹے تعصبات سے اپنے آپ کو بالا رکھ کر خلوص اور خدمت کی بلند سطح تک پہونچ سکیں اور صرف یہی چیز ہے۔ جو کسی قوم کو یقین، اُمید۔ آزادی اور قوت دے سکتی ہے"۔۔۔۔۔۔

آئندہ کوشش کا طریقہ

سیاسی اتحاد و اتفاق کی جانب بڑھنے کے لئے ہندوستان کی ترقی کے راستہ میں جو نہایت مہیب مسئلہ حائل تھا۔ اسکے قابلِ اطمینان حل کی وجہ سے ہماری آئینی جنگ قبل ازیں گویا نصف ختم ہو چکی ہے۔ ہندوستان کا متحدہ مطالبہ جو ملک کی حقیقی ضروریات پر مبنی ہے اور جو وقت و حالات کا لحاظ رکھ کر وضع کیا گیا ہے وہ آخر کار اپنے آپ کو ناقابل مقابلہ ثابت کر کے رہیگا۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جو لوگ حکومت ہند کے ذمہ دار ہیں۔ اُنہوں نے باشندگان کی موجودہ شکایات کے ساتھ مصالحت و ہمدردی کے زیادہ فیاضانہ طریقہ سے سلوک کرنے کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے صلح ہوتے ہی مسئلہ ہند کو دلیرانہ اور فیاضانہ طریق پر حل کرنا ہوگا اور ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کے آزاد ذمہ دار اور ہم رتبہ رکن کی حیثیت سے اس کا پیدائشی حق دینا ہوگا۔ یہ تبدیلی کس طرح عمل میں آنی چاہیئے اور اس حل کے لئے کیا طریقے اور تدابیر ہونی چاہئیں۔ یہ وہ امور

ہیں۔ جنہوں نے ہندوستانی جمہوریت پسندی کے خیالات کو گذشتہ دو سال سے گھیر رکھا ہے۔ جدید حل کی متعلق تجاویز تیار ہوچکی ہیں۔ اور اُن کو امپیریل کونسل کے انیس ۱۹ منتخب نمائندوں نے گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کردیا ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ گذشتہ سال آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اور اُس کو مجاز کیا گیا تھا۔ کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی کمیٹی کے مشورہ سے اصلاحات کی ایک اسکیم مرتب کرے۔ اور اس سال استصواب اور غور کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کی جائیگی۔

جب آپ **اصلاحات** کی اسکیم منظور کرلیں۔ تو آپ کانگریس اور لیگ کے ذریعہ سے واضعان آئین سے ایک مسودہ قانون تیار کرائیں۔ جو قانون حکومت ہند کے لئے جس پر ہمارے ملک کا موجودہ نظام قایم ہے۔ ایک ترمیمی مسودہ کی حیثیت رکھے گا جب یہ مسودہ قانون تیار ہوجائے تو انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کو چاہیئے کہ وہ اس کی تصدیق کریں اور پھر دونوں جماعتوں کے سربرآوردہ، اور قائمقام اصحاب کا ایک وفد مقرر کیا جاوے جو اس مسودہ کو پارلیمنٹ میں پیش اور منظور کرائے۔

اس میثاق کے ذریعہ سے مجالس مقننہ میں مسلمانوں کا حسب ذیل تناسب نمایندگی تھا، پنجاب ۵۰ فیصدی، صوبہ متحدہ ۳۰، بنگال ۴۰، بہار ۲۵، صوبہ متوسط ۱۵ مدراس ۱۵، بمبئی ۳۳٫۳، اور مرکز میں ہندوستانی منتخب شدہ اراکین میں سے ⅓

یہ میثاق حکومت کے سامنے پیش کیا گیا اور بالآخر لارڈ چیمسفورڈ گورنر جنرل اور مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے اپنی رپورٹ ۱۹۱۸ء میں جداگانہ انتخاب قائم رکھنے کی ضرورت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ "اس کے ساتھ ساتھ حقائق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے

مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء میں مخصوص نیابت اور جداگانہ انتخاب دیا گیا تھا۔ دونوں فرقوں کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا ہے اس میں ہندوؤں کی رضامندی شامل ہے۔ اسلئے مسلمان ان دونوں چیزوں کو امور فیصل شدہ قرار دیتے ہیں اور ان کو بدلنے کی کوشش بھی کی گئی تو اس کے خلاف نہایت سختی کے ساتھ احتجاج کیا جائے گا جب ہاؤس آف لارڈز میں یہ بل پیش ہوا تو علاوہ اور تائیدات کے لارڈ سنہا نے بھی پرزور تائید کی۔ چنانچہ مسلم لیگ کے مطالبات۔ حقوق تسلیم کرلئے گئے۔ اور حق رائے دہی کا جداگانہ نظام قائم رہا۔ چونکہ اس اسکیم کی ضمنی کارروائیوں میں حکومت ہند اور سیکرٹری آف اسٹیٹ نے کچھ اختلاف کیا تھا اور اب بعض دیگر معاملات بھی پیش تھے اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں اور ان کے ردعمل کا سلسلہ بھی جاری تھا اسلئے ذیل میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ایک ایڈریس کا اہم اقتباس بھی اس ضمن میں قابل اندراج ہے۔

ڈاکٹر انصاری ۱۹۱۸ء صدر جماعت استقبالیہ:
مسلم لیگ منعقدہ دہلی

گورنمنٹ کے نام نہاد زاویہ نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس کی مزید شہادت اس امر سے حاصل ہوتی ہے کہ مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ان کے اس خاص حق کی مخالفت کی ہے جو زمانہ موجودہ میں ہماری سیاسی تحریکات کا روح رواں ہے ان قیمتی وعدوں پر جو گورنمنٹ کرچکی ہے اس سمجھوتہ پر جو ہمارے اور اہل ہنود کے درمیان ہوچکا ہے اور خود اپنے قومی مفاد پر نظر کرتے ہوئے ہم حکومت کو اپنے وعدوں سے روگرداں ہونے کی

اجازت نہیں دے سکتے۔ علاوہ بریں مسلمانان ہند کے نمایندے امپریل کانفرنس اور مجلس جنگ کے مباحث میں نہ شریک کیا جانا مسلمانان کے اس احساس میں اضافہ کرتا ہے کہ ان کے ساتھ لاپروائی برتی جارہی ہے۔ یہ احساس اور بھی زیادہ ہوجاتا ہے جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مجلس صلح میں جہاں ایسے سوالات زیر بحث آئیں گے۔ جن کا تعلق مسلمانوں کی موت وزیست سے ہے ہمارا کوئی نمایندہ موجود نہ ہوگا، ایک غیر مسلم خواہ وہ ہمارا کیسا ہی ہمدرد اور دوست ہو اسلامی مسائل پر نہ اس وثوق کے ساتھ زبان کھول سکتا ہے نہ اس جوش اور تیقن کے ساتھ بولنے کا دعویٰ کرسکتا ہے جس کی ایک مسلمان نمایندے سے اُمید ہوسکتی ہے

حضرات بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی وہ اخوت اسلامی جو ان کے اور تمام مسلمانوں کے درمیان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہتے ہوں رشتۂ محبت قائم کرتی ہے درحقیقت اس وطن پرستی کے خلاف ہے جو جس کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔ میں نے بعض دوستوں کو کہتے سنا ہے کہ "ہندوستان کا مسلمان جزیرہ نمائے گیلی پولی کی ایک انچ زمین کے بدلے سارے ہندوستان کو قربان کردینے کو تیار ہے" حضرات اس قسم کی باتوں سے جن کی تصدیق واقعات ہرگز نہیں کرتے حقائق کے چہرہ کو مسخ کیا جاتا ہے ہندوستان کے ہر معرکہ میں ہم اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں شانہ بشانہ رہے ہیں۔ ہمارا سیاسی مطمح نظر اب اہل ہنود کے واسطے دور نہیں، ہندو مسلمانوں کا وہ سمجھوتہ جس نے لکھنؤ میں عملی شکل اختیار کی تھی ہر سال تقویت حاصل کرتا جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جتنا زمانہ گذرتا جاوے گا ہمارے باہم مراسم بہتر ہوتے جائیں گے اور اگر اس وقت افتراق کے کچھ اسباب موجود ہیں تو وہ بھی رفع ہوجائیں گے میرا غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ

ایک سچا مسلمان ہمیشہ سچا وطن پرست ہوگا۔ اگر ہم مسلمانان ٹرکی و ایران کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے طرزِ عمل نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے ان ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت کرتے ہیں جو غیر ممالک میں مقیم ہیں کسی سے کم نہیں وہ حق پرست یعنی احمد محمد کچالیہ ہندوستان ہی کا ایک مسلمان تھا جو جنوبی افریقہ میں عرصہ تک لڑتا اور آخر تک ہمارے حقوق کی اس شیر دل علم بردار مسٹر گاندھی کی جانشینی کا پورا حق ادا کرتا رہا لیکن جہاں ایک مسلمان دونوں قوموں کے متفقہ حقوق کے لئے لڑنے کو تیار رہے وہاں وہ اس ملک میں اپنی سیاسی حالت کو برقرار رکھنے کا عزم بالجزم کر چکا ہے اور نہایت استقلال کے ساتھ اپنے تمام جائز حقوق کی حفاظت کرے گا۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس جگہ کٹارپور کے اندوہناک واقعات کا ذکر کیا جائے جہاں ہندوؤں نے بے قصور اور صلح جو مسلمانوں کے ساتھ بغیر اشتعال کے وحشیانہ سلوک کیا ہے ان ہولناک واقعات کو پڑھ کر مجھے جو صدمہ ہوا ہے وہ بیان سے باہر ہے ناراضگی اور غصہ کے جو جذبات ہم سب کے دلوں میں ہیں ان کا اظہار کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ اس قسم کے واقعات دونوں قوموں کے تعلقات کو خراب کرتے ہیں اور اس باہمی اتحاد کی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہیں جس کے ہم سب آرزومند ہیں میں اپنے ہندو بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسی موثر تدابیر اختیار کریں کہ آئندہ اس قسم کے واقعات کا سدباب ہو جائے۔ حالات کے ہر پہلو پر نظر کرنے کے بعد میرا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا سیاسی مطمح نظر حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کریں تو یقیناً ہندو بھی مسلمانوں سے جدا رہ کر اپنی منزل مقصود تک ہرگز نہیں پہونچ سکتے۔ رواداری نہ کہ انتقام ہم دونوں کا مطمح نظر

ہونا چاہیے۔

باب چہارم

قبل ازیں کہ تیسری قسط اصلاحات کو بیان کیا جائے۔ ہندو مسلم اختلاف و فسادات اور ان کے اسباب اور کچھ درمیانی حالات کا بھی کسی قدر تذکرہ ضروری ہے جو ہندوستانی کی ترقی یا آزادی کے لیے سد سکندری رہی ہے۔

ہندو مسلم فسادات کی ابتدا ۱۹ انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے جن کے اسباب عوام و جہلا کے مذہبی تعصبات تھے۔ اسی صدی کے پہلے عشرہ (۱۸۰۸) میں بنارس میں ایک خوفناک فساد ہوا۔ ہندو عوام نے مسجد پر حملہ اور شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اور جب تک کہ پچاس مسجدیں برباد اور صدہا انسان نہ تیغ نہ ہو گئے۔ اس وقت تک فوج بھی امن قایم نہ کر سکی۔

اسکے بعد صدی کے آخری چار عشروں میں سخت فسادات ہوئے جن میں ۱۸۹۳ء نہایت خوفناک تھا۔ اعظم گڈھ میں ذبیحہ گاؤ اور بمبئی میں محرم بنائے فساد تھا۔

اس فساد کے بعد ہی مسٹر تلک نے جو مرہٹوں اور کانگریس میں زبردست اثر رکھتے تھے۔ انجمن مخالفین ذبیحہ گاؤ[1] کی بنیاد ڈالی اور ہندوؤں کی جنگ جویانہ اسپرٹ ابھارنے

---

[1] بنارس کی گئو رکھشنی سبھا کے اہتمام سے ایک تصویر بنائی گئی تھی۔ ایک گائے کے جسم میں کثرت سے دیوتا بیٹھے ہوئے ہیں، چند تصویریں مختلف اقوام و مذاہب کے لوگوں کی اس کے تھنوں کے قریب ہیں اور ایک ہندو دودھ تقسیم کر رہا ہے۔ دو صورتیں گائے کے منہ کے سامنے ہیں جن میں سے ایک کی تھوتنی خنزیر کی اور جسم ایک وحشی سفاک کا جو تلوار لئے ہوئے گائے پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری تصویر ایک

اور ہندوستان کی سیاسی دنیا میں اُن کے تسلط کی کوشش کی، اب جہلا وعوام کے مذہبی جنون و تعصب میں سیاست بھی داخل ہوگئی۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال سے جس میں مسلمانوں کی کوشش کا کوئی شائبہ نہ تھا اِن کے خلاف پورے بنگال میں سخت جذبۂ عنا د پیدا ہوگیا۔ جو شدید قسم کے فسادات کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔ اسی زمانہ میں بنگالی ڈاکوؤں کا گیت "بندے ماترم" جو انتہائی تشدد کے جذبات پیدا کرتا ہے اور جس میں دیویوں سے مناجات کی جاتی ہے ان بنگالی ایجی ٹیٹروں کا قومی نعرہ یا گیت بن گیا۔

۱۹۱۲ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کے بعد کچھ سکون ہوا اور پھر میثاق لکھنؤ نے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد ڈالدی۔ ہندوؤں نے مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کی اور مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ سیاسیات میں اشتراک عمل کیا اگرچہ فسادات کا سلسلہ بند نہیں ہوا لیکن جذبۂ اتحاد میں ترقی ہوتی رہی۔

خلافت کمیٹی کا جو ۱۹۱۹ء میں تحفظ خلافت اسلامیہ (عثمانیہ) کے لئے قائم ہوئی تھی۔ کانگریس کے ساتھ مواخات قائم ہوگئی۔ ترک موالات کی تحریک اگرچہ

حاشیہ بقیہ صفحہ ۵۰:۔ برہمن کی ہے جو حملہ آور اور گائے کے درمیان حائل ہے۔ دُم اور پشت کی طرف کچھ اشلوک سنسکرت میں ہیں، جن کو کوئی رشی ہاتھ اٹھائے جب رہا ہے گائے کے پاؤں کے نیچے قرآن مجید کی آیت لن تنال الخ (خدا کے پاس کچھ قربانی اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقوٰے اس تک پہونچتا ہے۔

یہ تصویر بہت رائج رہی اور پھر ۱۹۱۳ء میں جب کہ ہندو قربانی گاؤ کے بند کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ جرمنی میں تیار کرائی گئی تاکہ بوجہ ارزاں ہونے کے بکثرت شائع ہوسکے۔

مسٹر گاندھی کے دماغ کی پیداوار تھی اور کانگریس نے اس کو منظم صورت میں پیش کیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اسلام اور مذہب کے نام پر اس کی ہمہ گیری میں کارنمایاں کیا اب یہ دونوں انجمنیں سیاست و مذہب کی حمایت میں ایک جان دو قالب ہوگئیں۔ بظاہر کانگریس یا سوراج کو خلافت سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن گاندھی جی نے اس اصول پر کہ ہمیں یہ نکتہ نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ جب تک خلافت کی شرط تحریک میں نہو گی مسلمانوں کو سوراج میں دلچسپی لینے پر ترغیب دینا ممکن نہیں مسئلہ خلافت کو جزو تحریک بنا لیا۔

حتیٰ کہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب ایم۔اے۔او کالج پر علی برادرس نے حملہ کیا کہ وہ سرکاری گرانٹ سے انکار کرے اور یونیورسٹی سے تعلق منقطع کرے اسکے ممبران اسٹاف اور ٹرسٹیز سرکاری خطابات واپس کردیں۔ سرکاری وظائف مسترد کردئے جائیں تو مسٹر گاندھی[ل] اور سوامی سیتا دیو نے اس حملہ آور جماعت کی قیادت کی اس تعلیمی تحریک ترک موالات کو ہندوؤں نے کہیں قبول نہیں کیا بنارس میں پنڈت مالویہ نے گاندھی جی اور علی برادران کو یونیورسٹی میں تقریر تک کی اجازت نہ دی ہندو رہنما اور ماہرین تعلیم نے مخالفت جاری رکھی اور پھر گاندھی جی نے بھی زور نہیں دیا۔ بایں ہمہ ۱۹۲۲ء میں ہی یہ فضائے اتحاد مکدر ہو گئی۔ کوہاٹ کے فسادات کے بعد شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات وجود پذیر ہوئیں۔ تنظیم و تبلیغ کا جوابی نظام قائم ہوا اور بے اعتمادی طاری ہو گئی۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۳ء میں اس بے اعتمادی کے

ل ۱۹۲۱ء میں یہ تحریک ترک موالات زور پر تھی حتیٰ کہ شاہزادہ ویلز کا بائیکاٹ بھی اس کے پروگرام میں داخل تھا ہندو یونیورسٹی نے ان سیاسی زعما کے علی الرغم حضور ممدوح کو مدعو کرکے آنریری ڈگری پیش کی اور اظہار عقیدت و وفاداری کے مراسم ادا کئے۔

وجود کو بھی صاف کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ :۔

"موجودہ ہندو مسلم اتحاد کے باوجود اب تک بہت سی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہندوستان کی آبادی کے ان دو بڑے فرقوں کے درمیان موجود ہیں۔ اور یہ امر بہت اہم ہے کہ ہم ان غلط فہمیوں کی حقیقی نوعیت کو ذہن نشین کریں۔

ہندوؤں کے دلوں میں یہ شبہ خطور کرتا ہے کہ موقع ملنے پر یا تو ہم اپنے ہم مذہبوں کو باہر سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے بلائیں گے یا کم از کم ان کو مدد پہونچائیں گے جب کہ وہ خود ہندوستان کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے حملہ آور ہوں گے۔ اور یہ شبہ اس قدر عمیق طور پر دلوں میں جاگزیں ہے اور عام طبقوں میں اس طرح پھیلا ہوا ہے۔ کہ جہاں تک میری واقفیت کام دیتی ہے کوئی ہندوستانی مدبر سوائے لوکمانیہ مسٹر تلک آنجہانی کے اس سے نہیں بچا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو یہ شبہ ہے کہ حکومت خود اختیاری حاصل ہوجانے پر ہندو زیادہ سیاسی اختیارات حاصل کرلیں گے اور اپنے تعدادی غلبہ کو مسلمانوں کے کچلنے میں استعمال کریں گے۔

اسی سال کانگریس کے اسپیشل سشن دہلی میں ایک اتحادی کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ جس نے ڈاکٹر انصاری اور لالہ لاجپت رائے کو فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل تجویز کرنے کے لیے مامور کیا اور انہوں نے بمقام سولن ایک حل (سولن پیکٹ)[۵۱] تجویز کی جس میں جداگانہ انتخاب کے اصول اور پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تسلیم کرلیا گیا۔ مگر جب کانگریس

---

[۵۱] اس پیکٹ میں مذہبی تنازعات کا بھی حل تھا اور گاؤکشی کی بھی اجازت تھی (جس وقت یہ رپورٹ (پیکٹ) اجلاس میں پیش ہوئی تو زبردست شور مچایا گیا۔ لالہ لاجپت رائے کی لیڈری سے انکار کیا گیا۔ مختلف حصص ہند سے تین سو تار احتجاج میں آئے نتیجہ میں کانگریس گھٹنوں کے بل گری۔

کے اجلاس میں پیش ہوا تو مہاسبھائی اثر سے مغلوب ہوگیا اور رد کرکے پھینک دیا گیا مگر بنگال میں مسٹر سی۔ آر داس کامیاب ہوگئے اور انہوں نے فرقہ وار نمائندگی کے ساتھ کونسلوں اور ملازمتوں میں تناسب منوالیا۔

مہاسبھا کی بعض کارروائیوں نے اُن مسلم زعما کو بھی جو اتحاد کی انتہائی ساعی تھے۔ انتہائی بدگمان کردیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اس طرزِ عمل پر کانگریس کے بعض لیڈران کو متنبہ کیا۔ لیکن انہوں نے مہاسبھا کے خلاف ایک لفظ کہنے سے بھی انکار کردیا۔ ان سخت معرکہ آرا فسادات میں جو اس زمانہ میں ہو رہے تھے مسٹر گاندھی نے خاموشی اختیار کرلی۔ مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی اور دیگر مسلم زعما نے ان سے درخواست کی کہ اپنے اثر سے اس فضا کو صاف کریں مگر مہر سکوت نہ ٹوٹی۔ مولانا محمد علی نے مجبور ہوکر کانگریس میں ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالویہ کے رویہ پر سخت نکتہ چینی کی جس کا اونا گوارا اثر ہوا۔ مسیح الملک کو بھی جب پنڈت موتی لال نہرو سے ناکامی ہوئی تو انہوں نے جتادیا کہ وہ اب مسلمانوں سے بھی کچھ توقع نہ رکھیں۔ یہی زمانہ انتخابات کا تھا۔ اور انتخابات ہی کی وجہ تھی کہ کانگریس مہاسبھا سے مرعوب ہوگئی تھی۔ اور اس کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی انتخابات کے موقع پر جب مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تو مالویہ جی نے ایک مہاسبھائی کو کھڑا کرکے شکست دلوادی۔ اور پنڈت موتی لال نہرو کو کہنا پڑا کہ مالویہ جی نے مشترک حلقہ انتخاب سے قابل مسلمانوں کی مخالفت کرکے مخلوط انتخاب کو گہرا دفن کردیا ہے۔

مگر یہ فسادات بالکلیہ ہی ناقابل اعتنا نہ تھے اور حالات نے مجبور کردیا کہ تدابیر امن پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد ہو۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں بمقام دہلی

اس کا انعقاد ہوا مگر ہندو مسلم زعما نشستند و گفتند و برخاستند سے کچھ زیادہ نہ کر سکے اور حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

۱۹۲۵ء میں مسلم لیگ کا بھی ایک اہم اجلاس مسلم یونیورسٹی جوبلی کے موقع پر ہوا جس کی صدارت آنریبل سر عبدالرحیم (صدر اسمبلی) نے کی انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں تمام سیاسی حالات پر ایک پرمعنی اور بسیط تبصرہ کیا جو ان کے وسیع تجربات کا نچوڑ ہے۔ اس تبصرہ میں انہوں نے کہا کہ:۔

"میں آپ کی توجہ شدھی۔ مہاسبھا اور سنگھٹن کے تحریکوں کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اول الذکر کا مقصد لاکھوں مسلمانوں کو ہندو کرنا ہے۔ اور آخر الذکر کا مدعا یہ ہے کہ ہندوؤں کو مدافعت اور حفاظت کا اہل بنایا جائے۔ اور مہاسبھا ایک ایسی انجمن ہے۔ جو تمام کارروائیوں پر حاوی ہے مسلمان اُن تمام تحریکوں کو جو لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند جیسے رہنمایان کی سایہ عاطفت میں پرورش پاتی ہیں۔ ایک اہم ترین مذہبی چیلنج تصور کرتے ہیں جو اُس عیسائی جہاد سے مہلک اور خوفناک ہے جو صدیوں پیشتر ارض فلسطین میں برپا ہوا تھا۔ یہ چیلنج صرف مذہبی نہیں بلکہ یہ ایک بڑا خطرہ ہے۔ جو سیاسی میدان میں ترقی کرنے سے مانع ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے تنظیم کی بنیاد ڈالی ہے۔ مجھے یقین ہے ہندوستان کی تاریخ میں اس زمانہ سے زیادہ کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اسقدر کشیدگی اور بدمزگی پیدا نہیں ہوئی۔ سچ ہے کہ بعض ہندو لیڈروں نے علی الاعلان مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا ذکر کیا ہے۔ جس طریقہ سے اسپین سے مسلمان

خارج کر دیئے گئے۔ ورنہ بقول اُن کے لازم آئے گا کہ مسلمان شدھی ہو کر ہندو بنیں اور اُن کے سیاسی پروگرام کے ہم نوا ہوں۔ ایسی حالت میں ہمیں ایرانی فلسفی کا قول یاد رکھنا چاہیئے کہ :- "دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد"

ہم کو یہ یاد کرنا پڑے گا کہ ابنائے وطن ہم سے زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ حتیٰ کہ انگریز بھی ان کے زہریلے پروپیگنڈے سے خائف ہو چلے ہیں۔ جو ایک ایسا آلہ حرب ہے۔ جس کی گرم بازاری جنگ عظیم کے زمانہ میں مہلک گیس اور ہوائی جہازوں کے ساتھ ساتھ ہوئی تھی۔ اور جو یورپین قومیت کی برکات میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ مسکین اور معصوم صورت حضرات برابر کام میں مشغول ہیں۔ اُن کی ایک جماعت نے خود اسلام اور اسلامی مجالس پر حملہ کرنے میں بدطولیٰ حاصل کر لیا ہے۔ دوسری جماعت تاریخ کے صفحات کو مسخ کر رہی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی جستجو میں ہے کہ اسلام سے ہندوستان کو کبھی کوئی نفع نہیں پہنچا۔ اور یہ کل حضرات یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم قوم نہایت ناکارہ ہے۔ اور ایسے افراد سے مرکب ہے۔ جو بتذل ترین ہندوؤں کے بھی ہم پلہ نہیں ہیں۔ وہ ہمارے بہتر سے بہتر پبلک افراد کی تذلیل کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں سوائے اِن چند اصحاب کے جو سیاسی عقائد میں اُن کے ہم نوا ہیں۔ اِس تبلیغ اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا لازمی نتیجہ کیا ہے۔ فسادات اور تنازعات اور وہ اصحاب رنجیدہ ہونے کے بجائے خوش ہوتے ہیں۔ جب کوئی مسلمان غصہ سے مجبور ہو کر دیوانہ دار بدلہ لیتا ہے۔ کیوں کہ اُن کو ایسا زرین موقعہ ہاتھ آجاتا ہے کہ وہ مسلمان کی مذہبی دیوانگی اور مذہبی جوش و خروش کو بدنام کر سکیں اس طریقہ سے ابنائے وطن نے کون سی سُرخ روئی حاصل کر لی ہے۔ یہ سُرخ روئی

صفر سے زیادہ بے وقعت اور حقیر ہے۔ انہوں نے اپنے جارحانہ طرزِ عمل سے صاف ظاہر کر دیا کہ مسلمان کبھی اُن کو اپنی قسمت کا فیصلہ سپرد نہیں کر سکتے ہیں چنانچہ ہم کو مدافعت اور تحفظ کی ہر ممکن تدابیر اختیار کرنا چاہیئے۔ ہم مسلمانوں کو ان مدبروں سے نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہیئے۔ کہ اُن کا یہ دعوے کہ ہندوستان محض ہندوؤں کی ملکیت ہے۔ سراسر باطل اور بے بنیاد ہے۔

ہم اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی بعض مشترکہ صفات ان کی فہم و فراست اُن کی کفایت شعاری اور اُن کی محنت قابلِ رشک ہیں۔ اور میں ابناءِ وطن کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں اُن کی قابلیت کی قدر کرتا ہوں۔ ہر وہ شخص جو مسلمانوں کی تاریخ سے واقف ہے۔ اور ہماری اُن قوموں کے حالات سے باخبر ہے جو اسپین سے لے کر سائبیریا تک اور ماسکو سے وسط افریقہ تک حاوی ہے۔ ضرور تسلیم کرے گا کہ ہم ہمیشہ انسانی قابلیت اور ہمت و مردانگی کی قدر کرتے چلے آئے ہیں۔ خواہ کسی قوم ملت میں یہ صفات پائے جاتے ہوں۔ ہم نے ہمیشہ ہر ملک میں لایق افراد کو تلاش کیا۔ اُن پہ اعزاز و اکرام کی بارش کی نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے تمام دیرینہ علوم فنون اور سائینس کو جمع کیا۔ اور بہت تھوڑے ہی عرصہ میں ایک قابلِ رشک جداگانہ تہذیب کی عمارت دنیا کے سامنے پیش کر دی وہ لوگ نہایت مہلک طور سے تنگ نظر ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کی کارگذاری کی تحقیر کرتے ہیں۔ اور ہماری سیاسی خدمات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ہمارے نقائص کے باوجود ہم سے زیادہ شاید ہی کوئی ایسی قوم ہو جو مذہبی تعصب سے اس قدر پاک نظر آئے اور وہ ملک کے رہنما جو ہماری پبلک پیش قدمی پر سدراہ ہوتے ہیں۔ یقین کریں کہ اُن کا سلف گورنمنٹ

قائم کرنا بغیر ہماری امداد کے ایک امر موہوم ہے - ہندوستان کا مستقبل اُس وقت روشن ہو سکتا ہے - جب ہم تمام ان مختلف اقوام کو جو یہاں بستی ہیں پوری آزادی سے کام کرنے دیں - اور اُن غیر ملکی اقوال سے اُن کو سراسیمہ نہ کریں - جو تھوڑے عرصہ قبل یہاں کبھی سُنے بھی نہ گئے تھے - اس گروہ کے ہندو رہنما خیال کرتے ہیں - کہ ہم ان دیگر ممالک سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں - جہاں مُسلمان آباد ہیں - اور بس ہمارا جذبہ حب وطن ایک بڑی حد تک ناقص ہے - ایک مشترکہ تہذیب - تاریخ - روایات - زبان اور قومیت ہمدردی اور برادرانہ محبت اُن اقوام میں پیدا کر سکتی ہے - جن کے سوشل خیالات یکساں ہوں تو کیا جائے - تعجب ہے اگر کوئی ہندوستانی مُسلمان افغانستان - ایران - وسط ایشیا - ٹرکی و عرب میں سفر کر رہا ہو - تو وہ اُن میزبانوں کی طرز معاشرت اور اخلاق و عادات میں کوئی زیادہ فرق نہ پائے گا - اور بے تکلف ہو کر وقت گذار سکے گا ان کے برخلاف ہندوستان ہی میں اور بالخصوص ایک ہی شہر میں جہاں ہم رہتے ہیں ہمارے سوشل طریقے ہمارے ہمسایہ سے بالکل مختلف ہیں - علاوہ ازیں بعض اسلامی ممالک ہمارے مذہبی مرکز بھی ہیں - مثلاً حجاز - فلسطین - عراق - ٹرکی - ایران - اور سائبیریا جن کا گوشہ گوشہ تاریخی اور مذہبی روایات کا مخزن ہے - ہم اپنی بین الاقوامی وسیع النظری پر نازاں ہیں اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں - کہ ہندوستان ایک بڑا خوش حال خطہ ہوتا - اگر اس کی سرزمین میں ذات اور چھوت چھات کی قیود رائج نہ ہوتیں جہاں تک واقعات کا تعلق ہے - ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ بیرونی ممالک سے سازش کرنے میں ہندو قوم کے بعض نمایاں افراد ہی ملوث ہیں - اور جس حد تک ان کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہوں گی - اسی قدر ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود بعید تر

ہوتی جائیگی - وہ مدبر جو انگریزوں کو ہندوستان سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ خیال کرتے
ہیں کہ ہم مسلمان اس حالت میں ایک بیرونی مسلم فرمانروا کو ہندوستان میں حکومت
کرتا ہوا پسند کریں گے۔ یہ اسی قدر صحیح ہے جس قدر یہ کہ انگریزوں کے بعد ہندو
یہ پسند کریں گے کہ ہندوستان کی سرزمین ہندوؤں کے زیرنگیں ہو۔ مسلمان خاموشی
کے ساتھ ان تمام واقعات کو مطالعہ کر رہے ہیں۔ اور میں پُرزور الفاظ میں عرض
کروں گا کہ ہم ہندوستان میں ایک خود مختار حکومت اسی وقت دیکھنا پسند کرتے ہیں۔
جب وہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے اُس قدر پاسبانی کرے جس قدر ہندوؤں کی۔ دراصل
یہ وہی مطمح نظر ہے جو ہم ابنائے وطن کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ اور دل سے
خواہش کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر ہماری معاونت کریں ورنہ سوراج
ہوم رول سلف گورنمنٹ جیسے پرشکوہ الفاظ ہمارے لئے مطلق دلکش نہیں ہیں۔ یہ امر
باعث مسرت ہے کہ چند ہندو رہنما دو قوموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے
بہت کوشاں ہیں۔ اور مسلمان درحقیقت اس جدوجہد میں پیش پیش ہیں۔ اور ہم یہ واقعہ
کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ بعض مسلمانوں نے ہندو رہنما کو مساجد کے ممبر پر جگہ دی
ہے۔ اس خیال سے کہ اُن سے اخلاص و محبت کی پوری توقع تھی۔ مگر نتائج اس قدر
حوصلہ شکن ہیں کہ ہم اُن کو بیان بھی نہیں کر سکتے۔ اسکے باوجود یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے
جس کا حل کرنا ناممکن ہو مگر ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اِن ریشہ دوانیوں کا
سد باب کریں۔ جو بعض ہندو مدبر انگریزوں کے صبر و تحمل سے فائدہ اُٹھا کر حصول
سوراج کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اور جو اپنے منزل مقصود کی مشکلات و مصائب کی
تاب نہیں لا سکتے غالباً عرصہ دراز کے بعد ان دو قوموں میں کوئی اتحاد پیدا ہو سکے

جسکے دورِ حاضرہ میں اسباب مفقود ہیں۔ اِس مسئلہ کا حل بظاہر اِس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ ہم ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک ہی نوعیت کی شرائط بود و باش عطا کریں ۔ جو یقیناً اقتصادی اور دماغی نشو و نما کا باعث ہو گا ۔ اور ایک خاص گروہ سے وہ سیاسی طاقت و اہمیت فنا کر دے گا ۔ جس کی وجہ سے ملک میں فتنہ و فساد برپا ہو رہے ہیں ۔ کیا ہمارے ابناء وطن اِس مقصد میں ہمارے شریک ہو سکتے ہیں ۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس مقصد کی تکمیل یکایک نہیں ہو سکتی یہ دراصل ایک اہم ترین سوال ہے ۔ جس کا غیر خوشگوار اثر دنیا کے گوشہ گوشہ میں محسوس کیا جا رہا ہے ۔ اور وہ سوشل تحریک جو فطرتِ انسانی پر مبنی ہے ۔ ضرور اپنے کرشمے دکھا کر رہے گی ۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ہندوستان میں اِس کا خیر مقدم کریں اور ملک کے خصوصی حالات کے موافق اُس میں ترمیم و تنسیخ کریں ۔ وہ محض جدید سائنس کا ساختہ سراب نہیں ہے ۔ جس کا حاصل کرنا دائرہ امکان سے باہر ہے وہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جو اسلام کی بنیادی اصول پر مبنی ہے ۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں کسی گروہ یا جماعت کو غیر معمولی اہمیت نہیں دی گئی ہے ۔ وہ انفرادی حقوق کا محافظ اور سرمایہ داران کا سخت ترین مخالف ہے ۔ ہمارے ملک میں اکثریت اور اقلیت میں اِس وجہ سے جلد تمیز کی جا سکتی ہے کہ ان کے مذہب ، گذشتہ تاریخ میں اختلاف اور تمدن و تہذیب زندگی کی رسوم اور معاشرتی فرائض میں نمایاں فرق ہے اور اِن کا کوئی سیاسی اُصول جس طرح کہ انگلستان کے قدامت پسند آزاد خیال اور معاشرتی جماعتوں میں پایا جاتا ہے ۔ اس کا باعث نہیں قرار پا سکتا ۔ ہندو اور مسلمان قومیں جو خاص طور پر آبادی کے اجزائے ترکیبی ہیں ، بحیثیت مجموعی ہندوستان میں چار اور ایک کی نسبت رکھتے ہیں ۔ یہاں تک

کہ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ یہ دونوں قومیں تقریباً مساوی طور پر تقسیم کی گئی ہیں گو کہ مسلمان کچھ زیادہ ہیں۔ پھر آپ جو چاہیں سو کریں۔ ووٹ بڑی حد تک لوگوں کے مختلف انواع اثرات اور ملک کے مختلف انتظامات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ہندو کل ہندوستان میں ایک رفیع مرتبہ پر ہیں۔ کہ وہ ساہوکار وکیل اور زمیندار ہیں۔ اور کل پبلک اختیارات جو نہ صرف گورنمنٹ کے مختلف محکمہ جات مثلاً مالگذاری۔ محکمہ انتظامی۔ پولیس اور عدالت میں بلکہ میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ۔ لوکل بورڈ یونیورسٹیوں۔ کالجوں۔ اور اسکولوں محکمہ صحت عامہ اسپتالوں۔ شفاخانوں۔ یہاں تک کہ ہر شعبہ کے سرکاری طبقہ کے اجزا اتر کیبی بنے ہوئے ہوں۔ اسکے علاوہ ان کی انتظامی حالت بھی بہت عمدہ ہے۔

ہماری سیاسی حالت کی کمزوری خصوصاً بنگال میں زیادہ ہے۔ جہاں مسلمان ہندوستان کی مجموعی آبادی کے ⅓ حصہ سے زیادہ ہیں۔ اور اس صوبہ کی کل آبادی میں ۵۵ فی صدی ہیں۔ بنگال کی انجمن وضع قوانین کے نصف سے زیادہ اراکین ہندو مدبرین کی ایک جماعت کے انتظام، رہنمایانہ امداد اور اثر کی وجہ سے اپنے عہدہ پر مقرر ہیں۔ اور اسی لئے اپنی ذات کو ان کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ میں اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ کونسل میں بعض سیاسی تفرقہ اندازیوں کی وجہ سے دو مسلمان وزیر ہو گئے تھے اور جنہیں محکمہ جات منتقلہ تفویض کئے گئے تھے۔ لیکن وہ اپنے عہدے سے ووٹوں کی ایسی مجموعی تعداد کی وجہ سے جس میں بعض مسلمان کے ووٹ بھی شامل تھے علیحدہ ہوئے تھے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی وجہ ان کی کوئی ایسی نامعقول

پالیسی نہ تھی ۔ جسے وہ اپنے مفوضہ محکمہ جات میں استعمال کر رہے تھے ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ مسلمان اراکین کا طرز ان بعض اہم مسائل کے متعلق کیا تھا ۔ جو موجودہ کونسل میں پیش کیے گئے تھے ۔ آپ بنگال کے ہندو مسلم معاہدہ کے متعلق سن چکے ہیں ۔ جس نے کتنے مسلمان ممبروں کو ایسی سیاسی جماعت میں شریک ہونے کے لئے متاثر کیا جو چالاک ہندو دماغوں کے زیر اثر تھیں ۔ اور انھیں کے سرمایہ و انتظام سے چلائی جاتی تھیں ۔ جب کونسل میں اس معاہدہ پر بحث کی گئی ۔ اراکین نے ایک ایسے اہم مسئلہ کی جس نے نہ صرف بنگال بلکہ کل ہندوستان میں تفرقہ اندازی کی ہے ۔ بنگال کونسل میں اس کی عقدہ کشائی کو اپنے ووٹوں کی مدد سے ایک نامحدود مدت تک ملتوی کر دیا ۔ کل ہی رات کی بات ہے کہ گورنمنٹ کی جانب سے ایک بل پیش کیا گیا تھا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اخراجات کے لئے ایک مستقل امداد فراہم کی جائے ۔ ایسے سرمایہ کی اہم ضرورت تھی ۔ کیونکہ یونیورسٹی جس کا مستقبل نہایت خوش آیند معلوم ہوتا تھا ۔ اور جو پہلے ہی سے اپنی شاندار کارگزاری فضائے امن و حفاظت میں دکھلا رہی تھی ۔ یہ یونیورسٹی بنگال کے مشرقی حصہ کی ضروریات کو پورا کرتی ۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کی کافی تعداد پیدا کرتے ہیں ۔ اگرچہ وہ مجموعی تعداد کے ۲/۳ حصے کے مالک ہوتے ہیں ۔ اور یونیورسٹی کے با اختیار طبقہ میں مسلمانوں کی نمائندگی نصف سے زیادہ ہوتی ہے ۔ اس کا مسلم مال ان بنگالی مسلمانوں کے لئے ایک شاندار مستقبل رکھتا ہے ۔ جو ابھی تک تعلیمی لحاظ سے پیچھے ہیں ۔ اور با ایں ہمہ کونسل کے مسلمان سوراجی ممبروں نے اس مسئلہ کی مخالفت میں ووٹ دیا اور کسی نے اس کی مخالفت میں تقریر کرنے کی جرأت نہیں کی انہیں میں سے ایک نے اس مسئلہ کی تائید میں جسے مناسب موقعہ

پر یقینی طور پر ان کے ووٹ دہندگان تک پہنچایا جائے گا۔ تقریر کی لیکن پھر بھی ووٹ دیتے وقت اپنے مخالفوں کا ساتھ دیا۔ بہر حال مخالفتوں کے باوجود بل قانون کی صورت میں منظور کر لیا گیا اور ڈھاکہ یونیورسٹی نقصان سے بچ گئی۔ ان لوگوں اور ان کی جماعت کا آخری زمانہ چند روز قبل معرض عمل میں آیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بنگال میں نوّے ۹۰ فیصدی آبادی زراعت پیشہ ہے۔ اور ان کاشتکاروں کی محنت پر جو روزمرہ بنجارات (وبا) کی متاثرہ دلدلوں میں کام کرتے ہیں۔ صوبہ کی دولت اور خوشحالی کا انحصار ہے۔ کونسل کے آخری اجلاس میں ایک اہم لیکن حد درجہ معتدل مسئلہ پیش کیا گیا تھا جس کا مقصد موجودہ قانون مزارعان بنگال کی کارروائی کو ترقی دینا اور اس کے ساتھ ہی رعیت کو کچھ اطمینان بخشنا تھا۔ کونسل کی مجوزہ منتخبہ جماعت کے طبقہ میں مقتدر کافی اثر رکھنے والے زمینداروں کی کثرت تھی اور انجمن وضع قوانین کے چند اراکین نے تین ۳ یا چار ۴ ناموں کے اضافہ کی تحریک کی۔ جو اُن لاکھوں بے زباں کاشتکاروں کی حالت کو جن میں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ پیش کرنے کے قابل ہوتے بنگال کی سوراج پارٹی نے جس میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ چالیس میں بیس ۲۰ مسلمان اراکین ہیں۔ اسی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس تحریک کو شکست دینے کے لئے گورنمنٹ کا ساتھ دیا۔ دوسری تحریک جو اُن کی مدد سے منظور ہوئی۔ مجوزہ تعداد (کورم) توسیع کے متعلق تھی تاکہ منتخبہ جماعت کے با اثر زمیندار اگر چاہیں تو کمیٹی وقت پر رپورٹ دینے کے ناقابل ہو گی۔ اور بل خود بخود نامنظور ہو جائے گا جب کہ اس کونسل کی زندگی ایک سال کے اندر ختم ہو جاتی ہے۔ بنگال کی سوراج پارٹی میں نہ صرف اکثر دولتمند زمیندار ہیں بلکہ اس سے

کافی مدد حاصل کرتی ہے - پس اس طرح یہ امر حد درجہ مشکوک ہے کہ آیا وہ کبھی ایسی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں - اُن مزدوروں اور رعایا کی ایک ذمہ داری کو بھی پورا کر سکیں جن کے وہ نمایندہ ہیں ؛

سب سے پہلی مثال جس میں دو سال کی تحصیل لاحاصل کے بعد اُنہوں نے ایک نئی اسپرٹ پیدا کی جسے "اہم ذمہ دارانہ اتحاد" کہا جاتا ہے ایسی اُمید کے لئے تباہ کن ہے - سوراجی سیاسی جماعت کی حیثیت میں کم از کم بنگال کی مجلس قوانین میں ناکارہ حیثیت رکھتے ہیں - اور ان کے مسلمان مددگار ایک فریب ہیں - جو بنگال کے مسلمان انتخاب کنندگان کے مجرم ہیں - اس امر کے معلوم کرنے کے لئے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی حالت مشکلات اور پیچیدگیوں سے لبریز ہے - اس میں ایسے کارکن موجود ہیں جو کافی تفریق آراء اور کام کی وسعت پذیری میں کوشاں رہنے کے لیئے پابند ہیں : —

ہمیں وزیر ہند کی طرف سے اس امر کی دعوت دی گئی ہے کہ ہم حکومت کے سامنے ایک ایسا آئینی نظام پیش کریں جس کے متعلق عام طور پر اتحاد پایا جائے میرے خیال میں اس عام اتحاد رائے سے خاص طور پر ہندو اور مسلم اتحاد رائے مقصود ہے - اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں جماعتوں کے سربرآوردہ نمایندوں کی ایک مجلس شوریٰ منعقد کی جائے اور مجھے اُمید ہے کہ اس مجلس کا انعقاد جلد سے جلد ہوگا تاہم کچھ ایسے عام مسائل موجود ہیں جن کے متعلق عملاً مسلمانوں میں اتحاد رائے موجود ہے میں ان کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں اور اُنہیں پھر عرض کئے دیتا ہوں جس شخص نے کہ ہندوستان کے انتخابی نظام تاریخ کا مطالعہ کیا ہے - خواہ یہ انتخابات

مجالس وضع قوانین کے ہوں یا میونسپلٹیوں یا ڈسٹرکٹ بورڈوں، یونیورسٹیوں یا دوسری خود انتظامی جماعتوں کے اس امر کا یقین ضرور ہو گیا ہو گا کہ باستثنار ان چند مقامات کے جہاں مسلمانوں کو نمایاں طور پر تعدادی غلبہ حاصل ہو۔ دوسرے مقامات پر مشترک حلقہ ہائے انتخاب کے توسط سے مسلمانوں کا منتخب کیا جانا ناممکن ہے۔ اگر آپ اس طرزِ عمل کو پیش نظر رکھیں۔ جو ان دونوں جماعتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہے تو یہ امکان بالکل قرین قیاس اور فطری نظر آتا ہے۔ لہذا اس امر کی توقع تو کوئی نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے ایک عام اور مشترک حلقہ انتخاب قابلِ قبول ہو گا۔ باقی رہی یہ تجویز کہ حلقہ ہائے انتخاب تو مشترک ہوں۔ لیکن خاص مسلمانوں کے لئے چند نشستیں محفوظ کر دی جائیں تو یہ پہلی تدبیر سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ اگر مجلس وضع قوانین اور دوسری خود انتظامی جماعتوں میں مسلمان قطعاً منتخب نہ کیے جائیں تو اس صورت میں وہ قطعاً آزاد ہوں گے۔ اور اس امر کے مجاز کہ ہر ممکن طریقہ سے ان کارروائیوں کی مخالفت کریں۔ جو ان کے اغراض کے لئے مضر ہیں۔ لیکن فرض کرو کہ متحدہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ سے مسلمان منتخب کیے گئے۔ ایسی صورت میں یہ امر قطعی ہے کہ یہ منتخب شدہ افراد تمام وکمال اپنے انتخاب کے بارہ میں با اثر ہندوؤں کے مرہون منت ہوں گے۔ اور ایسی صورت میں جہاں خود اُن کی اپنی جماعت کے آرا اور خواہشات کے پیش کرنے کا سوال یا اسکے اغراض کی حفاظت کا مسئلہ در پیش ہو گا۔ تو یہ بالکل عاجز ہوں گے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ خود علیحدہ قومی حلقہ ہائے انتخاب میں بھی یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ کمزور

انتخابی حلقے خواہ وہ تمام وکمال مسلمانوں ہی پر مشتمل کیوں نہوں زمینداروں اور ساہوکاروں، وکیلوں، اور خود مقامی عہدہ داروں کے اثرات میں آجاتے ہیں اور ان کا بڑا حصّہ ہندوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت مجالس وضع قوانین میں کچھ ایسے مسلمان اراکین پائے جاتے ہیں۔ جن کی حیثیت خود مختارانہ ہے۔ اور جو آزادی کے ساتھ اُن پر اپنے حلقہ ہائے انتخاب کی ضرورت اور خواہشات کو پیش کر سکتے ہیں۔ اگر حلقہ ہائے انتخاب مشترک کر دئے جائیں۔ تو ایسے اراکین کا انتخاب قطعًا ناممکن ہوگا۔ مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں ہے۔ خود یورپینوں کے لئے بھی علیحدہ انتخابی حلقہ رکھنے کی ضرورت محسوس کی جاچکی ہے۔ پس ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا۔ کہ موجودہ حالت میں کس طرح کوئی شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مسلمانوں کو علیحدہ انتخابی حلقوں سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ جو شخص ایسا کرے۔ یقین مانئے کہ اس کی خواہش اصلی یہی ہے کہ یہ جماعت قوم کی قانونی انجمنوں سے قطعًا خارج کر دی جائے۔ اب اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اُن نتائج کو مختصرًا پھر عرض کر دوں۔ جنہیں اب تک حالت حاضرہ سے بحث کرتے وقت میں نے ضمنًا بیان کیا ہے۔ اِن نتائج سے جو دوسرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ میں اُنہیں بھی عرض کر دوں گا ....

موجودہ صورت میں تمام طبقوں اور جماعتوں کے لئے ایک عام حلقہ انتخاب قائم کرنا ناممکن ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو بڑی بڑی اور اہم قلیل التعداد جماعتوں کے اغراض کو صدمہ پہونچے گا اور اس سے ملک میں شدید فتنہ وفساد پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ عام طور پر قلیل جماعتوں کے اغراض کی حفاظت کے لئے حفاظتی تدابیر

تو عمل میں لازمی ہوں گی لیکن اسکے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کو مجالس وضع قوانین میں ۳۳ فیصدی سے کم نشستیں نہ دی جائیں۔

۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء کے فسادات اور عام حالات نے ایسی نزاکت اختیار کرلی کہ لارڈ ارون کو دربارہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۲۷ء میں امن و امان کے لئے اپیلیں کرنی پڑیں کانگریس کمیٹی نے بھی اتحاد کانفرنس منعقد کی دہلی و شملہ میں اسکے اجلاس منعقد ہوئے۔ رزولیوشن اور فارمولا مرتب کئے گئے۔ لیکن نتیجہ میں ناکامیابی ہی نہیں بلکہ یہ خلیج اور زیادہ وسیع ہو گئی۔ حتیٰ کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کی شخصیتیں بھی نشانہ ملامت بنیں۔ حالانکہ آخرالذکر نے تو اس فضا کو صاف کرنے کے لئے تبلیغ و تنظیم تک کی مخالفت کر ڈالی تھی سوامی شردہانند۔ بھائی پرمانند۔ لالہ لاجپت رائے۔ ہردیال۔ اور پنڈت مدنموہن مالویہ سنگٹھن کو مضبوط بنانے میں مصروف رہے۔ اور زعمائے کانگریس اُن کی حوصلہ افزائی اور تعریف کرتے رہے۔ غرض ایک طرف جہلا کے فسادات کا سلسلہ غیر منقطع تھا اور دوسری طرف میں بے اعتمادی ترقی پذیر تھی۔ اسلئے کوئی کوشش نتیجہ خیز نہ ہوئی۔

۱۹۱۹ء کے قانون میں دس سال بعد اصلاحات کے متعلق تحقیقات کا وعدہ تھا۔ اور ہندوستانیوں کا مطالبہ بھی برابر جاری تھا۔ ۷ رجولائی ۱۹۲۸ء کو لارڈ برکنہیڈ وزیر ہند نے دارالامرا میں ایک طولانی تقریر کی جس میں تمام سیاسی مسائل پر مبسوط بحث تھی۔ اس میں فرقہ وارانہ اختلافات کے متعلق یہ بیان تھا کہ:۔

"سب سے بڑی تشویش جس سے آج ہندوستان کو سابقہ ہے وہ فرقہ درارانہ

اختلاف ہے ۔ جو سات کروڑ مسلمانوں کو کثیر ہندو آبادی سے جدا کرتا ہے ان اختلافات میں ہم اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنا نہیں چاہتے ۔ اگر کل ہم ہندوستان سے چلے آئیں تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں جنگ شروع ہو جاوے گی ۔ تین کروڑ جنگی قبائل جو سرحد افغانستان اور ہندوستان کے درمیان رہتے ہیں ۔ اون سے جو خطرات ہیں ۔ اُنھیں میں ایک طرف کردیتا ہوں ۔ واقعی حالات مجھے بلاشبہ ایسے معلوم ہوتے ہیں ۔ جنہیں میں نے بیان کردیا ہے ۔

میرا دماغ ہمیشہ اس طریقہ استدلال کو سمجھنے سے عاجز رہا ہے جو چالاک لوگوں کے قلوب سے نکلتا رہتا ہے ۔ جنہوں نے ہندوستان میں اپنے آپ کو ہمارا دشمن بنا دیا ہے ایسے بہت سے اشخاص ہیں ۔ میں نے اُن کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں نے ان سے دریافت کیا کہ آیا وہ خیال کرتے ہیں کہ برطانوی فوج جلد سے جلد ہندوستان سے نکل جائیگی ۔ مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے ایسے طریقہ عمل کی حمایت کی ہو ۔ درحقیقت ہندوستان میں کسی جماعت کا کوئی ایسا ذمہ دار لیڈر نہیں ہے جو کل یہ کہے کہ ہمیں فوراً کامل ذمہ داری دیدو اور ہم ہندوستان سے برطانوی فوج کی واپسی پر رضامند ہیں . . . .

مجھے اس موقع پر ایک سرسری حوالہ اس ناگوار فرقہ وارانہ اختلافات کا دینا ہے جس سے ہندوستان کے مختلف حصص میں روزافزوں تشویش پیدا ہو رہی ہے ۔ ان فسادات نے بعض اضلاع میں نہایت نازک اور ناگوار صورت اختیار کی اور یہ یاد دہانی کردی کہ مسائل ہند اس قدر سہل سلجھے ہوئے نہیں ہیں ۔ جیسا کہ بعض وقت اصلی واقعہ سے بہت دور ہو کر خیال کئے جاتے ہیں ۔

ہندوستان میں ان سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی نے جن کی روایات و خصوصیات میں جنگ جویانہ اسپرٹ اور جوانمردی ہے اور صورت حال کی اس نزاکت و دشواری میں مزید اضافہ کر دیا جو خود ہی پہلے سے زیادہ تھی۔ اس صورت حال کا حکومت ہند اور خود ہمارے دفتر سے نہایت توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا جا رہا ہے۔"

۱۹۲۵ میں ہندوستان کی تیسری قسط اصلاحات کے متعلق ایک رائل کمیشن کا اعلان ہوا۔ فروری ۱۹۲۶ء میں سوراجیہ پارٹی کی طرف سے اسمبلی میں ایک رزولیوشن پیش کیا گیا۔ کہ مکمل ذمہ دار حکومت کے خیال سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں اصلاح کی جائے اور اس مقصد کے لئے جلد از جلد ایک بڑی نمائندہ گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جو ہندوستانیوں کے جائز حقوق اقلیتوں کے تحفظ اور ہندوستان کے لیے ایک نئے کانسٹیٹیوشن کی اسکیم کی سفارش کرے۔ وغیرہ وغیرہ

گزشتہ پنج سالہ ۱۹۲۲ تا ۱۹۲۷ کے فسادات[۵۱] و رجحانات نے ہندو مسلمانوں کے مابین عام بدگمانی و بے اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اور صاف طور پر نظر آ رہا تھا کہ عنقریب حکومت خود اختیاری میں جو ترقی ہونے والی ہے وہ ہندو راج کے مترادف ہوگی۔ مسلمان اس ہندو راج کے تو جس میں ان کی اقلیت کے جذب و فنا ہونے کا صاف خطرہ تھا، خلاف تھے۔ لیکن دستوری ترقی کی زبردست خواہش اور ملکی و سیاسی اتحاد کی تمنا رکھتے تھے، اور اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں سر عبد القادر نے اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ میں اتحاد و شکست اتحاد اور مسلم حقوق پر بلسوط بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

---

۵۱ اس پانچ سال میں ۴۵۰ جانیں تلف ہوئیں اور پانچ ہزار آدمی مجروح ہوئے۔

"خود کانگریس نے جب یہ دیکھا کہ خلافت ترکی کی حفاظت کا سوال زرا زیادہ اہمیت پکڑ گیا ہے۔ اور مسلمانوں میں دو نئی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یعنی خلافت کمیٹی، اور جمعیتہ العلماء، تو اس نے ان دونوں کے ساتھ شرکت عمل کرنے کو زیادہ مفید سمجھا۔ لیکن اس اتحاد کی بنیاد استوار نہ تھی۔ مسلمانوں کو خلافت کے مسئلہ کا بہت زیادہ احساس تھا۔ اور انہوں نے یہ سمجھا کہ تحفظ خلافت میں کانگریس سے ان کو مدد مل سکیگی۔ ادھر بہت سے ہندو سیاست دانوں نے جنہوں نے مسئلہ خلافت سے اظہار ہمدردی کیا تھا۔ اس امر کی کوشش کی کہ اپنی اغراض کے لئے مسلم جذبات کے تلاطم سے فائدہ اٹھا لیا جائے اور ان کی یہ خواہش ہرگز نہیں تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی پائدار اور اصلی اتحاد قائم رکھا جائے۔ ہندوؤں کو عام طور پر اس بات کا یقین تھا کہ ترکی کی طاقت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور دول دنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہیگی۔ اسی بناء پر ہندو سیاست دان آزادی سے اس مسئلہ سے ہمدردی ظاہر کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ترکی کی ترکی تمام ہو چکی تھی۔ لیکن جب ترکی اس کشمکش کے بعد نئی قوت لئے ہوئے جاں بر ہوئی۔ گو اس کی مملکت کا رقبہ بہت کم ہو گیا تھا۔ تو ہنود کے جذبات میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور انہوں نے پھر مسلمانوں کے متعلق وہ مخالفانہ طرز عمل اختیار کر لیا۔ جو مہاتما گاندھی جی کے قوی اثر کی بدولت چند سے معطل ہو گیا تھا میرے خیال میں مہاتما گاندھی کو حقیقت میں مسلمانوں کے احساسات سے ہمدردی تھی۔ اور ان کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر کوئی سیاسی ترقی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کے بہت سے ہم مذہب اصحاب کو ان خیالات سے اتفاق نہ تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کا ایک نہایت

پُرزور ردِ عمل واقع ہوا جس میں نہ صرف مہاتما گاندھی کی ہی پالیسی کی مخالفت ہونے لگی بلکہ شدھی اور سنگٹھن جیسی تحریکات وجود میں آئیں۔ مہاتما جی نے کچھ عرصہ تک ہندوؤں کی اس غیر خوش گوار بڑھتی ہوئی رو کو روکنے کی کوشش کی جس میں فرقہ داری شامل تھی لیکن بجائے اس کے کہ ان کو کامیابی ہوتی انکی اپنی مقبولیت جاتی رہی اور انھیں پبلک زندگی سے قبل از وقت علیحدہ ہونا پڑا۔

مہاتما گاندھی کی طرح مسٹر داس آنجہانی کا بھی یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی ان دو بڑی جماعتوں کا اتحاد ضروری ہے۔ پس جو کام یہ دونوں عالی ظرف اصحاب کر رہے تھے۔ وہ رُک گیا اس کی جگہ ایک اور مخالفانہ تحریک پیدا ہو گئی۔ جس کے حامی پنڈت مدن موہن مالوی صاحب اور جناب لالہ لاجپت رائے جیسے صاحبان ہیں۔ جو ہمیں پھر اس فضائے سیاسی میں واپس لے جانا چاہتے ہیں جس کو ہم نے اپنی دانست میں ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا تھا۔ ہندو سبھا کی رجعت پسند پالیسی کے حامیوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ جو مخالفت ہو رہی ہے وہ نہایت کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔ اور ملک کے لئے بحیثیت مجموعی نقصان دہ ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جب تک یہ طرز عمل جاری رہے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی حقیقی اشتراک عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مجھ کو امید ہے کہ یہ کیفیت دیر تک قائم نہیں رہے گی۔ لیکن جب تک موجودہ شکل قائم رہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ حقوق کی منظم حفاظت کریں کانگریس اور مسلم لیگ کو چاہیئے کہ بحیثیت ملک کی دو سربرآوردہ سیاسی انجمنیں ہونے کے اول تو اس بات کا انتظام کریں کہ دونوں جماعتوں کے چیدہ چیدہ نمائندے

کسی مرکزی مقام پر ایک کانفرنس میں شریک ہوں۔ جیسا کہ ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا جب کہ مشہور و معروف میثاق لکھنؤ کی تصدیق ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاحات کی پہلی قسط جو ہمیں ملی ہے۔ اس میں اس باہمی سمجھوتے سے بہت سہولت ہوئی جو ان دونوں اقوام میں طے پایا تھا۔ اس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ لکھنؤ میں ہندو مسلمان نے باہمی رضامندی سے جس تناسب کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی کو مانٹیگو چمسفورڈ سکیم کے ذمہ دار واضعین نے زیادہ تر اپنے فیصلہ کی بنیاد قرار دیا اس کے بعد سے دونوں اقوام میں یہ احساس موجود ہے کہ بعض پہلوؤں کے لحاظ سے میثاق لکھنؤ میں ترمیم ہونی چاہیے یا اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہم ایک مرتبہ آپس میں مشورہ کر لیں تو ضروری ترمیمات کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اگر کوئی تازہ معاہدہ ہو جائے۔ یا اسی پرانے معاہدے میں جو اصول بنیادی مضمر ہیں ان کی کسی قدر ترمیم کے ساتھ تصدیق ہو جائے تو ہر بلا اصلاحات کے نفاذ میں بہت زیادہ سہولت پیدا ہو جائے گی مگر اس قسم کے اتحاد کے بغیر ہماری مشکلات کا کبھی خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کانگریس اس قسم کی تجویز کو کس نظر سے دیکھے گی۔ لیکن میں اس کو اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں اس جلسہ میں اس بات کا اظہار کر دوں کہ مسلمان میثاق مذکورہ کی تصدیق یا تجدید کے لئے تیار ہیں۔ اس کی شرائط کا فیصلہ مناسب غور و خوض کے بعد ہو سکتا ہے۔

اور ہم اپنے ہندو ہم وطنوں کی طرف دوستی اور رفاقت کا ہاتھ اس امید سے بڑھاتے ہیں کہ وہ بھی ہاتھ بڑھا کر دوستی قائم کریں اور اشتراک عمل کے متعلق گفت و شنید

کریں اگر کوئی ایسی کانگریس کبھی منعقد ہو تو اس کے سامنے سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو پیش کیا جائیگا۔ وہ اسمبلی اور کونسلوں میں اور دیگر پبلک جماعتوں میں مسلمانوں کی کافی نیابت کے انتظام کے متعلق ہوگا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ اسمبلی میں تو اُن کی نیابت کو مشکل سے کافی یا موثر کہہ سکتے ہیں۔ بہت سے صوبجات میں بھی ان کی تعداد قلیل ہے۔ وہاں ان کو میثاق لکھنؤ کے مطابق ان کی آبادی کے لحاظ سے کسی قدر زیادہ نیابت دی گئی ہے۔ لیکن اس اضافہ سے مسلمانوں کو اپنی مرضی پر چلانے میں تو کوئی اعانت نہیں مل سکتی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ انہیں اس سے کچھ اطمینان ضرور ہوتا ہے۔ ہندوستان کے صرف تین صوبے ایسے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے۔ یعنی بنگال۔ پنجاب۔ اور صوبہ سرحدی۔ ان میں سے آخرالذکر میں تاحال اصلاحات کو نافذ نہیں کیا گیا۔ میثاق لکھنؤ کے مطابق مسلمانان بنگال کو اس کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم حصہ ملا۔ اور ان کا کچھ حصہ اور پنجاب کا کچھ حصہ ان صوبوں کا تناسب پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ جہاں غیر مسلم اصحاب کی آبادی کثیر تھی۔ پنجاب میں اور غالباً بنگال میں بھی اس بات کا بہت احساس ہے کہ اگر تناسبات پر پھر نظر ثانی کی جائے تو اس اصول کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر ایک صوبہ کی قلیل التعداد اور کثیر الافراد جماعتوں کے ساتھ خواہ وہ ہنود کی ہوں۔ خواہ مسلمانوں کی یکساں سلوک رہے۔ جب بہت سے صوبوں میں غیر مسلم اکثریت کو اپنے ہاں کے امور پر موثر انداز میں اثر ڈالنے کا موقعہ دیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دیگر صوبجات میں انہیں مراعات کو روا نہ رکھا جائے۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہو۔

البتہ ہر جگہ قلیل التعداد جماعتوں کے حقوق کی مناسب حفاظت کا انتظام ہونا

چاہیئے۔ تاکہ کثیر التعداد جماعت کو اس بات کا موقعہ نہ مل سکے کہ وہ اپنی تعداد سے ناجائز فائدہ اُٹھالے یا اپنی طاقت کا غلط استعمال کرے۔ میرے خیال میں اس تجویز کی موزونیت کے متعلق کسی کو بھی بیجا اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اور اگر دونوں اقوام اس اصول کو مدِ نظر رکھیں تو نہایت مناسب ہے۔ لیکن اس راہ میں ایک مشکل حائل ہوگئی ہے۔ جس سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔ ہندو اصحاب اس بات پر زور دیتے ہیں اور یہ زور دینا بیجا نہیں کہ اگر مذکورہ بالا طریق پر نیابت قومی کی نظر ثانی کی جائے گی تو ان صوبوں میں سے جہاں مسلمانوں کی تعداد قلیل ہے اور جہاں ان کی نیابت میں اضافہ کیا گیا تھا۔ اِس اضافہ کو واپس لینا پڑے گا میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی مجموعی فیصلہ میں جو سارے ملک کے لئے ہو۔ یہ امر قرینِ انصاف نہیں ہوگا کہ ہم مذکورہ بالا اضافہ مانگتے رہیں۔ اس صورت میں جب ہم ان صوبوں میں جہاں ہماری تعداد کثیر ہو۔ اپنے جائز تناسب کا مطالبہ کریں اس وجہ سے اب بہت سے اصحاب متفق ہوتے جاتے ہیں کہ بمبئی۔ مدراس اور صوبجات آگرہ واودھ جیسے صوبوں میں ہماری جو نیابت قومی میں جو قلیل اضافہ ہوا ہے۔ اسکے باوجود بھی ہماری اقلیت بدستور رہتی ہے۔ اور اس سے کچھ عملی فائدہ نہیں ہوتا۔ برعکس اسکے بنگال اور پنجاب میں ہماری تعداد عملاً قلیل التعداد جماعتوں کے برابر پہنچ گئی ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ اِن صوبوں کے مسلمانوں پر ہے کہ آیا وہ اپنے اضافہ کو قربان کرنے کے لئے طیار ہیں۔ جو انہیں ۱۹۱۶ء کے سمجھوتے کے مطابق حاصل ہوا۔ اِس غرض کے لئے اِن کے دیگر بھائیوں کو جن کی دوسرے صوبوں میں تعداد زیادہ ہے اِس سے کچھ امداد ملے اور اپنی تعداد سے کچھ فائدہ

اُٹھا سکیں۔ یا وہ اِس مُضر اثر کے باوجود جو مُسلمانوں کی آبادی کے ایک حصّہ کثیر پر پڑ رہا ہے۔ موجودہ صورت حالات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ موجودہ تناسبات کی نگرانی پر مائل ہوں تو اس سے تمام قوم کو بہ حیثیت مجموعی نفع پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس برائے نام فائدہ کو ترک نہیں کرنا چاہتے۔ جو انہیں حاصل ہے تو پھر ہمیں اِس فیصلہ پر مردانگی کے ساتھ قائم رہنا چاہیئے۔ جو ۱۹۱۶ء میں طے پایا تھا اور موجودہ شکل سے حتی المقدور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ . . . .

اگرچہ تمام معقول ہندو لیڈر عام طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک مناسب نیابت قومی کا حق حاصل ہے لیکن اِن میں اکثر کا خیال یہ ہے کہ اِس نیابت قومی کو مخلوط یا مشترکہ حلقہ جات نیابت کے ذریعہ دینا چاہیئے۔ اور ہر ایک صوبہ میں مسلمانوں کے لئے نشستوں کی مقررہ تعداد محفوظ رکھی جائے۔ لیکن ان کا انتخاب مسلم اور غیر مسلم ووٹروں کے مشترکہ حلقے میں سے ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس صورت میں مشترکہ قومیت قائم کرنے میں نسبتًا زیادہ مدد ملے گی۔ اور ایسے افراد منتخب ہوا کرینگے۔ جن پر دونوں اقوام کو اعتماد ہوگا۔ میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ یہ تجویز ہندو مُسلم انتخابات کے جُداگانہ حلقہ جات کی نسبت جن پر مُسلمان بہ حیثیت جماعت اسقدر مُصر ہیں۔ سطحی نظر سے زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور بعض انگریز حضرات بھی جنہیں ہندوستانیوں کی خواہشات سے ہمدردی ہے۔ اس نظریہ کو زیادہ قابلِ قبول سمجھتے ہیں۔ اور اکثر یہ کہہ دیتے ہیں کہ جداگانہ حلقہ انتخابات کے حق میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ایک ناگزیر عیب ہے۔ اِن کے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ انہیں ہندوستان کے حالات کا کافی علم نہیں ہے وہ یہاں

کے حالات کا اندازہ انگلستان کے معیار سے لگاتے ہیں۔ جہاں صدیوں سے مشترکہ قومیت کا مطمح نظر موجود ہے۔ اور اسی مطمح نظر میں وہاں کی مشترکہ زبان اور تہذیب سے مزید پختگی اور استواری پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی حقیقی معنوں میں قومیت کی تشکیل ہونی باقی ہے اور اس تشکیل سے پہلے ہمیں ان بے شمار عقدوں کو حل کرنا ہو گا جو ذات پات کے اختلاف اور مذہب و تہذیب کے تضاد اور رہنے سہنے اور کھانے پینے کے جداگانہ طریق کے باعث موجود ہیں۔ یہاں نہ صرف کئی زبانیں مروج ہیں۔ بلکہ ہر ایک زبان کے شیدائی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی محبوب زبان کو ہر جگہ اور کل اغراض کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس قسم کے حالات میں یہ توقع فضول ہے کہ یورپ کے نظریات ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہونگے جہاں مختلف قومیں آباد ہیں۔ میں مغربی صاحبان کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اس خواہش میں کسی سے پیچھے نہیں کہ مغربی سیاسیات کی بہترین چیزوں کو حاصل کریں۔ اور اپنے ہاں صحیح معنوں میں نیابت قومی کے اصولوں پر یہ سوچے بغیر عمل نہیں کر سکتے کہ آیا وہ اس ملک کے مخصوص حالات کے موافق ہیں۔ یا نہیں جہاں تک ہمارے ہندو بھائیوں کا تعلق ہے مجھ کو اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ان کی مخالفت کس بنا پر ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ موجودہ صورت حالات میں مشترکہ انتخاب سے اکثر اوقات صرف ایک ہی فریق کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اور بعض صورتوں میں تو حلقہ انتخاب کے اندر شدید تنازعات رونما ہو جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جداگانہ طریق انتخاب کے فوائد ظاہر ہیں۔ یعنی انتخاب کے موقعہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں

غیر ضروری شکر رنجی پیدا نہیں ہوتی۔ اور مقابلہ صرف ایک ہی قوم کے افراد تک محدود رہتا ہے۔ مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات سے کوئی ایسا فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو ہندوؤں کو نہیں ملتا۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں قومیں جداگانہ طریق انتخاب کو مان لیں۔ تاوقتیکہ اس کو ترک کر دینے کی مشترکہ خواہش نہ ہو۔ میں ان میں سے نہیں ہوں جن کا یہ خیال ہے کہ یہ طریق ہمیشہ کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔ مگر یقیناً میری رائے یہ ہے۔ اس طریق انتخاب کو اس وقت تک ضرور بحال رکھا جائے۔ جب تک شک و شبہ اور بے اعتمادی کی موجودہ فضا موجود ہے جس کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ مختلف قوموں میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب کو جاری رکھا جائے۔ بعض حلقوں میں اس رائے کا اظہار کرنا معمول ہو گیا ہے کہ یہاں کی تمام مشکلات اور موجودہ ہندو مسلم کشیدگی کا باعث جداگانہ انتخابات میں ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات گمراہ کن نہیں ہو سکتی۔ اور مجھ کو امید ہے کہ جملہ بہی خواہان ملک عام اس سے کہ وہ یورپین ہوں۔ یا ہندوستانی سرکاری ہوں یا غیر سرکاری اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے خالی الذہن ہو کر غور کریں گے اور جملہ پہلوؤں پر کامل غور و خوض کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ حضور والبسرائے بہادر کی تازہ تقریروں سے مسلمانوں میں ایک قسم کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ شاید وہ جداگانہ طریق انتخاب کے خلاف ہیں۔ میں اس موقعہ پر یہ امر حکومت ہند اور حکومت انگلستان کے ذہن نشین کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ موجودہ حالات میں اُن کے حقوق کی حفاظت صرف اس طرح ہو سکتی ہے

کہ اُن کے لیے جُداگانہ حلقہ جات انتخابات کو قائم رکھا جائے۔ تاوقتیکہ ان کے ہندو بھائی ان کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کریں۔ جو ازروئے انصاف موزوں ہو۔ اِس قسم کی حفاظتی تدابیر اور دیگر امور تحفظ موجودہ حالات میں ناگزیر ہیں۔ کونسلوں اور دیگر جماعتوں میں مسلمانوں کی نیابت سے ملتا جلتا ایک اور مابہ النزاع مسئلہ ہے جس کے لحاظ سے مسلمانوں کی حیثیت کا بعض اوقات سرکاری افسران اور بعض اوقات ہمارے ہندو ہم وطن اور بعض اوقات دونوں کے دونوں بہت کچھ غلط انداز لگاتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ دعوےٰ ہے کہ ہمارا یہ حق ہے کہ ملک کے نظم و نسق میں مناسب حصہ انہیں دیا جائے۔ حقیقت میں یہ وہی مطالبہ ہے۔ جو ایک مدت سے کانگریس تمام ہندوستان کی طرف سے پیش کر رہی ہے۔ جب اس قسم کا مطالبہ یورپین افسروں کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا تھا۔ اِس ہندوستانی مطالبہ کا جواب سرکاری طبقہ کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر یورپین اصحاب کے زیادہ تناسب کی وجہ رنگ یا قوم کا امتیاز نہیں۔ بلکہ اس کا یہ سبب ہے کہ اِن میں اعلیٰ قابلیت پائی جاتی ہے اور وہ فرائض مفوضہ کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ کانگریس نے اس خیال کی صحت پر اعتراض کیا۔ چنانچہ اب یہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان میں قابل یا ذہین افراد کی قلت نہیں ہے۔ اور ہر ایک محکمہ کی ملازمت کے لیے لائق اور قابل اشخاص مل سکتے ہیں۔ یہ عجب بدقسمتی ہے کہ تقریباً پچاس سال تک ہندوستانیوں کی قابلیت کو تسلیم کرانے کی کوشش کے بعد ہمارے بعض ہندو ہم وطن جو کانگریس کے رکن بھی ہیں یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف ان ہی کی قوم کے افراد قابل ہوتے ہیں اور حکومت

کے عہدوں پر ہنود کی اکثریت اس بنا پر چاہتے ہیں کہ مسلمان لیاقت نہیں رکھتے۔
یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی نسبت تعلیم یافتہ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔
اور جب کسی سرکاری محکمہ میں کوئی آسامی خالی ہوتی ہے تو ہندو امیدواروں کی تعداد
مسلمانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسکے اسباب ظاہر ہیں۔ ہندوؤں کی آبادی بہت
زیادہ ہے۔ ان کے یہاں بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے
ہیں۔ اور جہاں تک مغربی تعلیم کا تعلق ہے۔ اُنھوں نے اسکے حصول میں بہت پہلے
سے ابتدا کی ہے۔ لیکن باایں ہمہ اکثر یونیورسٹیوں میں مسلمانوں نے اس بات کا ثبوت
پیش کر دیا ہے کہ اگر کسی فرد واحد کا کسی دوسرے سے مقابلہ کیا جائے۔ تو مسلمان
ذہن اور دماغی قابلیت کے لحاظ سے اپنے کسی ہندو ہم وطن سے کم نہیں۔ اور مختلف
مضامین کے مطالعہ میں مسلمانوں نے ان کی برابری کا بھی ثبوت دیا ہے۔ پس اگر ان
کے ساتھ انصاف برتنے کے اُصول کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا جائے۔ تو بہت سی
ناراضگی اور رشک ورقابت کا سد باب ہو جائیگا۔ جو آجکل موجود ہے اور جو موجودہ
شکر رنجی کے سببوں میں سے ایک سبب ہے۔ آپ کسی خاص سرکاری عہدہ کے
لئے کوئی خاص معیار قابلیت قایم کر لیجئے۔ اور ہندو مسلم اقوام اور دیگر اقوام کے
تناسب کو کسی خاص صوبے کی ملازمت کے لحاظ سے مقرر کیجئے۔ جو محکمہ یا صوبے
کی ضروریات کے مطابق ہو۔ اسکے بعد اس امر کی سرگرم کوشش کی جائے۔ تو
ہر قوم کو حصہ مناسب ملے بشرطیکہ وہ مطلوبہ قابلیت کے اُمیدوار مہیا کر سکے
اُمیدواروں کی قابلیت کا اندازہ لگانے میں صرف یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ
اُنہوں نے کس درجہ میں امتحان پاس کئے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ امتحانوں

سے ان کی قابلیت کا اندازہ لگانے میں معقول مدد مل سکتی ہے۔ بلکہ ان کے دیگر اوصاف کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے۔ جو عملی زندگی میں کچھ کم مفید نہیں ہوتے مثلاً چال چلن۔ خاندانی روایات۔ اور جسمانی قابلیت وغیرہ......

اس سلسلے میں اگر میں ایک اور عام غلط فہمی کا جو سرکاری ملازمت کے متعلق پائی جاتی ہے۔ ذکر کروں۔ تو بے جا نہ ہوگا۔ بعض اخبارات نیز بعض سیاست دان یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں مختلف اقوام کے تناسبہ نیابت پر زور دینا حب الوطنی سے بعید ہے اور یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ملازمت سے ملک کی آبادی کے ایک فیصدی حصہ کو بھی روزگار نہیں مل سکتا اور ہم کو چاہیئے کہ ۹۹ فیصدی کے مفاد کو مدنظر رکھیں جو گورنمنٹ کی ملازمت کئے بغیر اپنا پیٹ پالتے ہیں.........

سرکاری ملازمت کا سوال محض روٹیوں کا سوال ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ بلکہ قوت۔ موقعہ اور تربیت کا۔ اس ملک میں سرکاری ملازموں کو عموماً بہت زیادہ اقتدار حاصل رہا ہے۔ اور اب بھی باوجودیکہ زمانہ بدل گیا ہے ان کو بہت سے اختیارات حاصل ہیں۔ جنہیں وہ کسی قوم کے نفع کے لئے یا کسی قوم کے نقصان کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور اس قسم کے موقعوں پر متعلقہ جماعتوں کے لئے یہ دیکھنا نہایت ہی ضروری ہوتا ہے۔ کہ کسی خاص وقت پر یا کسی خاص مقام پر ذی اختیار اشخاص کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ذی اختیار حضرات کو اس بات کا موقعہ ملتا ہے کہ جسے چاہیں مدد دیں اور اگر اس قسم کے مددگاروں کی تعداد کسی جماعت میں زیادہ ہو۔ تو اس کا اثر نہ صرف موجودہ حالات

پر پڑتا ہے۔ بلکہ اس سے مستقبل بھی اثر پذیر ہوتا ہے مزید براں اگر یہ سوال محض روٹیوں ہی کا ہو تو بھی اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ اس کا اثر صرف چند لوگوں پر پڑیگا۔ ہندوستان میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اپنے خاندان کے لئے روزی کماتا ہے۔ اپنے دیگر عزیز اور متعلقین کا بھی کفیل ہوتا ہے پس آپ دیکھ لیں کہ اگر ملازمت میں ہزار آدمی ہیں تو ان سے کئی ہزار آدمیوں کو نفع پہنچ سکتا ہے اور اگر مسلمانوں کی حالت کو دیکھا جائے تو یہ مسئلہ ان کے لئے اور بھی زیادہ اہم نظر آئیگا۔ کیونکہ انکے لئے تجارت اور سوداگری کے راستے بہت کچھ مسدود ہیں۔ کیونکہ ایک تو ان کے پاس کافی سرمایہ نہیں ہے اور دوسرے زندگی کے ان شعبوں سے ہندوؤں کو باعتبار تربیت زیادہ مناسبت ہے۔ پس یہ ضروری بات ہے کہ گورنمنٹ اور ہمارے ہم وطن ہمارے اس مطالبہ کو کہ ہمیں سرکاری عہدوں میں مناسب حصہ دیا جاوے۔ از روئے انصاف جائز اور مناسب خیال کریں۔

سر عبدالقادر کی اس تقریر میں تلاطم جذبات کی طرف جو اشارہ ہے اس کو سمجھنے کے لیے چند واقعات اجمالاً بیان کرنے ضروری ہیں۔ مسلمان اس زمانہ میں اس درجہ پرجوش تھے کہ ۱۹۱۹ء میں جب وجے لکشمی پنڈت (صاحبہ) نے جو پنڈت موتی لال نہرو کی دختر ہیں برضا و رغبت اسلام قبول کیا اور مشہور جرنلسٹ مسٹر سید حسین اڈیٹر انڈیپنڈنٹ کے عقد نکاح میں آئیں تو اس سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ مسلمہ زعمائے سیاست نے محض ہندو مسلم اتحاد کی خاطر ان کے ارتداد کی تدابیر میں ہر قسم کی معاونت کی، اور پھر یہ نوبت پہنچی کہ مسلمانوں نے قشقے اور چندن کے ٹیکے لگائے۔ مسٹر تلک کی مصنوعی لاش پر پھول چڑھائے۔ راماین کی پوجا میں شریک ہوئے۔ رام لچھمن کو تاج پہنایا۔

ہندوؤں کو مساجد میں لے گئے۔ تکبیرہ پرجگہ دی۔ وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب "دو کرشن" مان لیا اور مسٹر گاندھی مثل امام مہدی کہے گئے ذبیحہ گاؤ بند کرنے کے لئے مسلم لیگ میں رزولیوشن پاس ہوا۔ فرنگی محل کے ایک عالم نے اس رزولیوشن کی جلسہ عام میں تحسین کی۔ اونٹوں پر پوسٹر چسپاں کرکے بانہ رہنے کاڈریا گندا کیا گیا۔ انہیں بزرگ عالم نے ایک خط شائع کیا جس میں مسٹر گاندھی کو اپنا رہنما تسلیم کرکے لکھا کہ میرا تو حال سر دست اس شعر کے مطابق ہے ؎

عمرے کہ بہ آیات و حدیث گذشت
رفتی و نثار بت پرستی کردی

اسی جوش و ہیجان میں تحریک ہجرت بھی کی گئی۔ ترک موالات میں ملازمتوں سے استعفے بھی شامل تھے، استعفوں کے ساتھ ساتھ افغانستان کی طرف ہجرت شروع ہوئی ہزارہا مسلمانوں نے اپنا گھر بار، جائداد کوڑیوں کے مول دوسری قوموں کے ہاتھ بیچ کر فریضہ ہجرت پورا کیا، مگر افغانستان کی حکومت نے بہت جلد داخلہ مہاجرین بند کر دیا۔ صد ہا درہ خیبر میں بے گور و کفن طعمہ زاغ و زغن بنے جو زندہ بچے وہ مصائب بھگتنے کے لئے رہ گئے، لیکن ان مفتی زعماء میں سے کسی نے مہاجر بننے کی سعادت حاصل نہ کی۔

نوٹ:۔ اس تلاطم کا ابھی تک نشان پایا جاتا ہے "تازہ واقعات ہیں کہ بنارس کے بھارت مندر کی افتتاحی رسم میں سرحدی مجاہد خان عبدالغفار خاں نے تلاوت قرآن مجید کی اور یہ تاریخی فتوے بھی دیا کہ اسلام کے ماضی میں غیر مسلموں کو مساجد کے اندر اپنی عبادت کرنے کی اجازت تھی اسی طرح خان موصوف نے حال میں بمقام کراچی ایک مندر میں کانگریسی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔

باب پنجم

سنہ ۱۹۲۴ء سے لیگ دستوری ترقی کے متعلق ہر سال برابر زور دیتی اور دوسری اقوام ہند کے ساتھ اشتراک عمل کیلئے آمادہ رہی لیکن اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور جداگانہ انتخاب بھی اسکا مطمح نظر رہا۔ تاہم اُسنے طے کیا کہ ہر قوم کو اختیار ہے کہ جب چاہے جداگانہ انتخاب کو مخلوط انتخاب سے تبدیل کر دے۔ ہندوؤں کا اصرار تھا کہ مخلوط انتخاب تحفظات کے ساتھ رکھا جائے۔ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء میں مسلمان زعمانے دہلی میں ایک نمایندہ کانفرنس منعقد کی اور اہم مباحثہ کے بعد طے کیا کہ اگر سندھ کو جداگانہ صوبہ بنادیا جائے اور دیگر صوبہ جات کیطرح صوبہ سرحد و بلوچستان کو مکمل اصلاحات دی جائیں جن میں ہندو اقلیت کو وہی مراعات دی جائیں گی جو مسلم اقلیت کو دوسرے صوبوں میں حاصل ہونگی اور کہ پنجاب و بنگال میں تناسب آبادی سے اور مرکز میں ⅓ نمائندگی ہو اور دیگر اہم تحفظات منظور کئے جائیں تو مخلوط انتخاب پر رضامندی دیدی جائے۔

مئی سنہ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز کو تقریباً منظور کر لیا اور یہ قرارداد بھی پاس ہوئی کہ مجلس عاملہ مرکزی اور صوبوں کی مجالس قانون ساز کے منتخب شدہ اراکین اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے مشورہ کر کے ہندوستان کیلئے سوراج کا دستور اساسی مرتب کرے جس کی بنیاد اعلان حقوق پر ہو۔ نیز اکتوبر میں مذہبی و معاشرتی امور کے متعلق ایک تجویز منظور کی گئی۔

اسکے بعد مدراس کانگریس نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ ہندوستان کے آئندہ کسی دستور اساسی میں جہاں تک

مختلف مجالس مقننہ میں نیابت کا تعلق ہے۔ تمام صوبوں کی مجالس مقننہ اور مرکزی ایوانوں میں جو اس اسکیم کے مطابق تجویز کئے جائیں گے مشترکہ نیابت کا طریقہ رائج کیا جائے گا اور اس خیال سے کہ ملک کی دو بڑی ملتوں کو پورا پورا یہ اطمینان رہے کہ فی الحال انکے جائز مفاد مجالس مقننہ میں محفوظ رہیں گے اور اگر خواہش کیگئی تو ان ملتوں کی یہ نیابت مشترکہ انتخاب میں آبادی کے تناسب سے ہر صوبہ کی مجالس مقننہ میں مرکزی جمعیت ہائے مقننہ میں نشستوں کو اس طریقہ کے ساتھ مقابل کر دیا جائیگا کہ پنجاب کی اقلیت کے ساتھ باہمی سمجھوتہ سے اس طرح مراعات کی جائیں کہ دوسرے صوبوں کی مجالس مقننہ میں اقلیتوں کو ان کی آبادی کے اعتبار سے جو نشستیں ملی ہوں وہ بھی زیادہ کردی جائیں پنجاب میں نمایندگی کے مسئلہ کا تصفیہ کرتے وقت سکھوں کی بحیثیت ایک اہم اقلیت کے نمایندگی کا خاص لحاظ رکھا جائیگا مسلمان زعما کی طرف سے صوبہ سرحد اور برطانوی بلوچستان میں اسطرح اصلاحات دئے جانے کی تجویز پیش کی گئی ہے جس طرح کی اصلاحات دوسرے صوبوں کو دی جائیں کانگریس کی رائے میں نہایت درست اور حق بجانب ہے اور اس پر عملدرآمد رکھنا چاہیئے اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ انتظامی امور میں جو تبدیلیاں کی جائیں اسکے ساتھ ساتھ عدالتی انتظامات بھی کئے جائیں۔ سندھ کو الگ صوبہ بنانے کی نسبت اس کانگریس کی رائے ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ مختلف صوبوں کو زبان کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے جسے کانگریس نے عرصہ ہوا تسلیم کرلیا ہے اور اگر کوئی صوبہ زبان کے اعتبار سے تقسیم کا مطالبہ کرے تو اسکے متعلق کارروائی شروع کرنے چاہیئے۔ یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ آیندہ ہندوستان کے کسی دستور اساسی میں ہر شخص کو ضمیر کی آزادی

حاصل ہوگی۔ اور کسی مجلس مقننہ کو خواہ مرکزی ہو یا صوبہ کی یہ اختیار نہ ہوگا کہ ایسی قسم کے قوانین بنائے جس میں ضمیر کی آزادی میں خلل پڑے ضمیر کی آزادی سے مراد اعتقادات عبادات کی آزادی، مذہبی اعمال و شعائر کی آزادی مذہبی تعلیم اور اشاعت کی آزادی ہے۔ موخرالذکر امور اس طرح ادا کئے جائیں گے کہ دوسروں کے احساسات کا پورا احترام کیا جائے۔ اور اسی طرح دوسروں کو جو حقوق حاصل ہوں ان میں مداخلت نہ ہو۔ کوئی ایسا مسودہ قانون ایسی قرارداد تحریک یا ترمیم کسی مجلس مقننہ میں پیش نہ ہوسکے گا۔ جس کی کسی ایک ملت کے تین چوتھائی ارکان جس پر اس مسودہ یا تحریک وغیرہ کا اثر پڑتا ہو مخالفت کریں۔ بین الملّی معاملات سے مراد ایسے معاملات ہیں جنھیں متعلقہ مجالس مقننہ کے ہندو مسلمان ارکان کی مشترکہ کمیٹی جو ہر مجلس کے آغاز کے وقت مقرر کردی جایا کریگی بین الملّی قرار دیں۔

یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ بلا ضرر ان حقوق کے جن کے ہندو اور مسلمان دعویدار ہیں یعنی ایک فریق جہاں چاہے باجہ بجائے یا جلوس نکالے اور دوسرا جہاں چاہے گائے کی قربانی کرے یا غذا کے اغراض کے لیئے ذبیحہ کرے مسلمان مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ گائے کے معاملہ میں ہندوؤں کے جذبات کا حتی الامکان لحاظ رکھیں اور ہندو ہندوؤں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مساجد کے سامنے باجہ بجانے کے معاملہ میں مسلمانوں کے احساسات کا حتی الامکان لحاظ رکھیں۔ اسلیئے یہ کانگریس ہندو مسلمانوں دونوں سے اسکی طالب ہے کہ وہ قربانی گائے یا مساجد کے سامنے باجہ بجانے کو روکنے کے لیئے تشدد یا قانونی ذرائع کو کام میں نہ لائیں۔

یہ کانگریس یہ قرار دیتی ہے کہ ہر فرد یا جماعت کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد یا جماعت کو دلائل یا رضامندی سے تبدیل مذہب کرائے۔ لیکن کسی فرد کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ تبدیل مذہب میں مداخلت کرے یا ایسے کرنے میں جبر دھوکہ یا دوسرے ناجائز ذرائع مثلاً مادی لالچ دلانے کا طریقہ استعمال کرے۔ اٹھارہ سال سے کم عمر والوں کا مذہب تبدیل نہ کرایا جائیگا۔ سوائے اسکے کہ انکے والدین یا ولی ان کے ساتھ ہوں اگر اٹھارہ سال سے کم عمر کے کسی آدمی کو کسی دوسرے مذہب والے اِدھر اُدھر گھومتا ہوا دیکھیں گے تو اس کو فوراً اس کے مذہب والوں کے سُپرد کر دینا چاہیئے۔ تبدیل مذہب میں اشخاص کے نام اوقات جگہ اور طریقہ کو چھپایا نہ جائے گا اور نہ اس سلسلہ میں کسی خاص مسرت کا نظارہ کیا جائے گا۔ جب کبھی تبدیل مذہب کے متعلق شکایت سُنی جائے گی کہ اسے خفیہ یا زبردستی یا دھوکہ یا دیگر ذرائع ناجائز سے کرایا گیا یا جب کبھی یہ پتہ چلے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے کسی شخص کا مذہب تبدیل کرایا گیا ہے تو اس کی تحقیقات کی جائیگی اور اس کا تصفیہ ثالث کے ذریعہ سے ہوگا۔ جن میں کانگریس کی مجلس عاملہ خواہ نام بنام یا عام ضوابط کے ماتحت مقرر کرے اسکے بعد ہی لبرل فیڈریشن منعقدہ بمبئی میں مسلم زعما کی خلوص نیت کا اعتراف کیا گیا اور مشورہ دیا گیا کہ مجوزہ تصفیہ کی مختلف مدات پر کسی قریب تاریخ میں فرقوں کے منتخب نمایندے اتحاد عمل کی پُرخلوص نیت کے ساتھ بحث و مباحثہ کریں جو مکمل اتفاق کی طرف رہنمائی کر سکے۔

اسی سال کلکتہ کے اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی حسب ذیل رزولیوشن پاس کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس کونسل مسلم لیگ کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ ایک سب

کمیٹی بدیں غرض مقرر کرے جو کانگریس کی مجلس عاملہ اور اسی قسم کی دیگر مجالس کیساتھ جنھیں کونسل مناسب سمجھے بلکہ ہندوستان کے دستور اساسی کے مسودہ کے تیار کرنے میں مشورہ کرے۔ تاکہ اسمیں مسلمانوں کے مفاد کا حسب ذیل تجاویز کے ساتھ تحفظ ہوسکے جن کی لیگ تصدیق کرتی ہے اور قبول کرتی ہے اور اس نیشنل کنونشن میں شرکت کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کرتی ہے۔ جسے کانگریس نے آیندہ مارچ میں دہلی میں منعقد کرنا طے کیا ہے۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کرکے خود مختار بنا دینا چاہیئے۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ صوبہ شمال مغرب اور بلوچستان میں اس طرح اصلاحات کا نفاذ ہونا چاہیئے کہ وہ بھی دیگر صوبوں کے برابر ہوجائیں تیسری تجویز یہ ہے کہ مجالس مقننہ میں بحالت موجودہ مسلمانوں کی جداگانہ نیابت ناگزیر ہے۔ اور اسلئے مسلمان کسی ایسی اسکیم کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتے جس سے ان کے قیمتی حق سے انہیں دست بردار ہونا پڑے۔ تاوقتیکہ سندھ کو ایک خود مختار صوبہ نہ بنایا جائے اور صوبہ سرحد و بلوچستان کو مکمل اصلاحات نہ دیدیئے جائیں۔ سب یہ شرائط کامل طور پر پورے ہوجائیں تب مسلمان جداگانہ انتخاب سے مخلوط انتخاب کے حق میں دست بردار ہونے کے لئے تیار ہوں گے۔ جس میں آبادی کے تناسب سے مختلف ملتوں کی نیابت کے لئے نشستیں اس طرح مخصوص ہوں گی۔ کہ (۱) سندھ اور بلوچستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہندو اقلیت کے ساتھ ان کی نشستوں کے تناسب میں وہی مراعات کریگی جو ہندو اکثریت دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیت کے ساتھ ان کی آبادی کے تناسب کے بارے میں کرے گی (۲) مرکزی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہوگی۔

لیگ بحیثیت مجموعی ان تجاویز کو بھی قبول کرتی ہے جو اس تجویز کے ساتھ کانگریس نے ضمیر کی آزادی مذہب۔ گائے۔ باجہ اور تبدیل مذہب کے متعلق منظور کی ہیں۔

اس سال کے یہ اجلاس نہایت یادگار تھے۔ ہندو مسلم زعمانے اتحاد و اشتراک عمل پر بڑی زوردار تقریریں کیں اور مبارکبادیاں دی گئیں۔ مسلم لیگ نے بھی سائمن کمیشن کا مقاطعہ منظور کر لیا۔ لیکن فروری ۱۹۲۸ء میں سر جان سائمن کی زیر صدارت وہ کمیشن بھی ہندوستان پہونچ گیا جس کے تقرر کا ۱۹۲۷ء میں اس غرض کے لئے اعلان کیا گیا تھا کہ وہ اس امر کی تحقیقات کرے کہ ہندوستان کہاں تک ذمہ دار حکومت کا اہل ہے۔ اور طریق میں کیا کیا تبدیلیاں مناسب ہیں۔ ادھر کمیشن اپنے متعلقہ امور میں سرگرم کار تھا۔ ادھر کانگریس کی قرارداد کے مطابق جماعت عاملہ نے (۳۰) مختلف انجمنوں کے نمائندوں کو دہلی میں مدعو کیا جس میں سے اکثر انجمنوں نے اپنے نمائندے بھیجے اور ۱۲۔ فروری تا ۲۲ فروری ۱۹۲۸ء روزانہ اجلاس منعقد ہوئے اور بالآخر طے پایا کہ ذمہ دار حکومت کو پیش نظر رکھکر دستور بنایا جائے۔ نیز صوبوں کی نئی تقسیم حلقہ ہائے انتخاب اور نشستوں کے تحفظ کے متعلق بھی تجاویز منظور ہوئیں اور ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے مدت معینہ میں اپنی رپورٹ جس میں تجاویز درج تھیں پیش کر دی جس میں ایسے اصول رکھے گئے کہ مسلم لیگ کونسل کو مجبوراً ان تجاویز پر ناپسندیدگی ظاہر کرنی پڑی اسنے اپنے نمائندوں کو ان ہی تجاویز کے منظور کرانے کی ہدایت کی جو اجلاس منعقدہ کلکتہ (۱۹۲۷ء) کی قرارداد میں موجود تھیں تاکہ وضع دستور کا کام شروع کرنے سے پہلے وہ ان کے متعلق مناسب کارروائی کر سکے۔ لیکن بجائے مصالحت کے ان مسائل پر مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا اور سکھ لیگ میں اختلافات

شدید رونما ہوگئے۔ کانفرنس کا اجلاس جو مارچ میں منعقد ہوا۔ اسنے دو سب کمیٹیاں مقرر کردیں جسمیں سے ایک کو سندھ کی علیحدگی کے مالی پہلو پر تحقیقات کرنے اور دوسری کو نمایندگی باعتبار تناسب لائق عمل ہونیکے متعلق غور و تجویز کی خدمت سپرد ہوئی کانفرنس نے رپورٹ کے شائع کرنیکا بھی حکم دیدیا اور ۱۹ مئی تک کے لئے ملتوی ہوگئی۔ اپریل میں جبلپور میں مہاسبھا کے اجلاس نے مسلم تجاویز سے شدید مخالفت کی قرار دادیں منظور کیں۔ ۱۹ مئی کو بمبئی میں پھر کانفرنس کا اجلاس ہوا لیکن فرقہ دارانہ مسائل پر سخت مخالفت تھی اور دہلی کے مقررکردہ کمیٹیوں نے بھی کوئی رپورٹ پیش نہیں کی تھی اب ایک جدید کمیٹی مئی ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے تحت صدارت مقرر ہوئی اور اسکو حکم دیا گیا کہ آیندہ یکم جولائی سے پہلے آئین ہند کے اصولوں پر غور کرے اور انہیں متعین کرے پھر مسودہ رپورٹ اظہار رائے کے لئے مختلف انجمنوں کے پاس بھیجا جائے اور فرقہ دارانہ اتحاد کیلئے مدراس کانگریس کی تجویز اور اسکے ساتھ جو تجاویز ہند و مہاسبھا مسلم لیگ، سکھ لیگ اور دیگر سیاسی انجمنوں میں جن کے نمایندے دہلی کی آل پارٹیز کانفرنس میں شریک تھے منظور ہوئی اور نیز دیگر ایسے مشورے جو بعد میں اسکو حاصل ہوں ان سب پر مکمل ترین طریقہ سے فکر و تامل کرے۔ مسلم نقطہ نظر کے اظہار کے لئے سر علی امام اور مسٹر شعیب قریشی ممبر منتخب ہوئے۔ جنمیں سے صرف اول الذکر ایک ہی اجلاس میں شریک ہوئے۔

رپورٹ آخر اگست میں بمقام لکھنو آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں پیش ہوئی سوراج کے سلسلہ میں تو اسنے درجہ نوآبادیات قبول کرلیا اور مسلم مطالبات تقریباً نظرانداز کردئے گئے اور جن کو باقی رکھا ان پر ایسے پیرایہ بیان میں بحث کی گئی جو نہایت دل شکن نہ صاف طور پر تسلیم

کر لیا گیا کہ اس قسم کے مطالبات فرقہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں اور سفارشات ممکن نہیں بنگال و پنجاب کی قلیل مسلم اکثریت کو خطرہ میں ڈالدیا، غرض بقول مولانا محمد علی مرحوم کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں منادی کیجاتی تھی تو منادی پکارتا تھا کہ خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا لیکن نہرو رپورٹ کا ملخص یہ ہے کہ خلقت خدا کی ملک والسرائے یا پارلیمنٹ کا ہے اور حکم ہندو مہاسبھا کا۔ اس رپورٹ کے سلسلہ میں یہ انکشاف دلچسپی سے دیکھا جائیگا کہ صوبہ سرحد کی بحث میں پنڈت مالویہ جی نے جب کچھ مطالبات پیش کیے تو ایک مسلمان نمایندہ نے کہا کہ آپ جو مطالبات کریں وہ بند لفافہ میں پیش کر دیں چنانچہ وہ لفافہ پیش ہوا اور مسلمان نمایندہ نے اسکو دیکھے بغیر منظور لکھدیا جب پنڈت موتی لال نہرو نے لفافہ کھولکر پڑھا تو اس میں ہندو مینارٹی کیلئے پچاس فیصدی نمایندگی مطلوب تھی اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ دیوانی و فوجداری کے وہ مقدمات جنمیں کوئی فریق ہندو ہو صرف ہندو یا یورپین جج کے سامنے پیش ہوں۔ پنڈت موتی لال نے اس کاغذ کو فوراً چاک کر دیا۔ غرض اس رپورٹ کی اشاعت سے علاوہ درجہ مستعمرات کے فرقہ دارانہ معاملات اور اقلیتوں کے مسائل پر بھی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور عجیب جوش و خروش کا اظہار ہوا مسلمانوں کے تمام سیاسی اداروں نے زبردست احتجاج کیے اور قرار دادیں منظور کیں۔

اس صورت حال میں کانگریس نے بمقام کلکتہ ۲۲ دسمبر کو رپورٹ پر بحث و مباحثہ کیلئے ایک آل پارٹیز کنونشن طلب کیا، لیگ نے ابتداً نمایندگی سے اجتناب کیا لیکن پھر مسٹر جناح کی ایک تجویز شرکت پیش کی جس کی رو سے جیسی نمایندے منتخب ہوئے کہ وہ شریک ہو کر ہندو مسلمانوں کے مابین متعدد مسائل کا تصفیہ کریں جو نہرو رپورٹ کی وجہ سے معرض بحث میں آ گئے تھے، کنونشن نے ایک کمیٹی مقرر کر دی تاکہ وہ ان امور پر بحث کرے جو لیگ

ڈیلیگیشن پیش کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اسکے مطابق کارروائی شروع ہوئی اور مطالبات یا نہرو رپورٹ میں ترمیمات پر مباحثہ کیا گیا۔ مگر کنونشن کی کمیٹی نے مسترد کر دیا، اسکے بعد مسٹر جینا نمایندۂ لیگ نے کنونشن کے اجلاس میں انھیں مطالبات کو ایک مدلل تقریر میں پیش کیا اور ان پر پوری روشنی ڈالی ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نمایندہ لبرل فیڈریشن نے مسٹر جینا کی پرزور تائید کی مہاسبھا مخالف تھی اور اسکے نمایندوں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اگر رپورٹ میں سے ایک کامہ (٫) بھی کم ہوا تو وہ اسکی تائید سے دست بردار ہو جائیں گے۔ غرض اس تمام کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ بھی منظور نہ ہوا۔

مسٹر جہاگلانے کنونشن کے رویہ کے متعلق ۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو جو بیان پریس کو دیا اس میں کہا کہ کنونشن کے اجلاس کے سامنے لیگ کی نمایندگی اس لئے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری ترمیمات کے بعد نہرو رپورٹ کو منظور کر سکیں گے۔ میں نہایت افسوس کیساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ کنونشن کو مسلم مطالبات پر نہایت فراخدلی سے غور کرنا چاہیے تھا، بجائے اسکے وہ ہندو مہاسبھا کے زیر اثر اور اسکی دھمکی میں آنکر یہ صورت اختیار کرتا۔ میں یہ امر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کے نمایندوں کی اکثریت کنونشن کے اجلاس میں شریک ہوئی تھی اور جنھوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو پیش کیا تھا۔ نہرو رپورٹ کے حامیوں میں سے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ صرف اپنی ملت کے ساتھ جنگ کی بلکہ اپنی جماعت (مسلم لیگ) سے محض نہرو رپورٹ کی تائید کرنیکے سلسلہ میں برائی حاصل کی۔ اگر کنونشن ان ۲۳ منتخب نمایندوں کیساتھ کسی امر پر گفتگو کرنے سے قاصر ہی تو سمجھنا چاہیے کہ وہ ہندوستان کے کسی مسلمان سے بھی فیصلہ کرنیکی قابلیت نہیں رکھتا اگر ان ۲۳ نمایندوں کو فرقہ پرست سمجھکر انکے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا گیا۔ تو سمجھ لو کہ ہندوستان میں ایک بھی مسلم

قوم پر ور موجود نہیں۔

جسطرح مسلم لیگ نے شفیع سکشن کو علیحدہ کر دیا۔ اور جسطرح اسنے پٹنہ کی اس تجویز کو جو علی برادران نے تیار کی تھی۔ رد کر دیا۔ یا آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں اپنے نمایندوں کے بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اسیطرح کنونشن کو بھی چاہیئے تھا کہ بہادری کیساتھ مونجے اور جیکار کیساتھ یہ عمل درآمد کرتا جو اجلاس کنونشن میں لحظہ بہ لحظہ دہمکی دے رہے تھے کہ وہ اجلاس چھوڑ کر چلے جاوینگے۔ مولانا محمد علی نے بھی جواب ہندو مسلم اتحاد کے بڑے مخالف اور بڑے فرقہ پرور سمجھے جانے لگے تھے اپنے اخبار ہمدرد میں حسب ذیل بیان شائع کیا۔

"دیار غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں۔ انہیں زبانوں سے جن سے آج اپنی ہجو سن رہا ہوں۔ اپنی تعریف میں ہزاروں قصیدے بھی سن چکا ہوں ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھائی مہاراشٹرے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد باردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مرادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دے گئے اُنکے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آزاد ہوئے۔ اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یادش بخیر! اب کلکتہ میں نام لیا گیا ہے۔ گیا میں سوراج پارٹی کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جسنے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھا ہی نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کیں۔ جنہوں نے اس مذہبی تعصبات کی آگ کو پھر بھڑکا دیا۔ جنہیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے اور اُسکے جواب میں مسلمانان پنجاب کے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کر دیا۔ جو آج وطن پرستی

اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے ۔ نہ ہم نے ڈاکٹر مونجے مسٹر آنے اور مسٹر کیلکر کی طرح مہاتما گاندھی کے خلاف اس بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ جو بالآخر پنڈت موتی لال کے خلاف بھی جوابی تعاون کے لاجواب نام سے ظاہر ہوئی ۔ نہ ہم نے گیا میں اس تحریک کے خلاف پنڈت موتی لال اور انکے سوراجی ساتھیوں کی طرح علم بغاوت بلند کر کے حصہ لیا۔ نہ پنڈت مدن موہن مالوی اور سوامی شردھانند کیطرح ہندو مہا سبھا کی قایم کردہ سنگٹھن اور شدھی کی تحریکوں میں حصہ لیا اور نہ ڈاکٹر کچلو اور انکے رفقاء کیطرح تبلیغ و تنظیم کے نام سے اپنا ڈھنڈورا پیٹا آج یہی حضرات کلکتہ کی تماشاگاہ میں اپنا سوانگ بھر رہے ہیں

پنڈت موتی لال نہرو اور انکے ساتھیوں کو کونسلوں اور اسمبلی کی شرکت نے جو کچھ سوراج دلوایا وہ ہمارے سامنے ہے ۔ اس شرکت میں پنڈت جی کو جو آج کانگریس کے صدر ہیں اتنا اصرار تھا کہ انہوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس نے اس شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگریس کے گرد اگرد دو سو میل کے احاطہ میں بھی قدم نہ رکھوں گا میں نے اس خیال سے طوعاً و کرہاً اپنی پارٹی سے آج کے غداروں کو کانگریس دکنونشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں یہ دو جیل سے نکل کر مہاتما گاندھی مجھ سے شکایت نہ کریں کہ تم نے کانگریس سے اتنی بڑی اقلیت کو کیوں نکلوا دیا ۔ ورنہ دہلی اور کوکناڈا میں موتی لال جی کو شکست فاش نصیب ہوتی ۔

نہرو رپورٹ کے متعلق یہ واقعہ بھی یادگار ہے جس سے ہندو مسلم زعما کی ذہنیت عیاں ہو جاتی ہے کہ :—

" کانگریس اور کنونشن سے مایوس ہونے کے بعد دہلی میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد ہوئی صوبہ کی کونسلوں کونسل آف اسٹیٹ اور اسمبلی کے ممبروں

کے علاوہ مسلم لیگ خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء کے سربر آوردہ ارکان شریک ہوئے
صدارت کے لئے ہز ہائنس سر آغا خان کا انتخاب ہوا۔ نہایت غور و خوض اور اتحاد
و سنجیدگی کیساتھ اس کانفرنس نے ایک مفصل تجویز مرتب کی جس کو سر محمد شفیع مرحوم
نے پیش کیا اور شفیع داودی ڈاکٹر سر اقبال۔ سر محمد یعقوب۔ مفتی کفایت اللہ۔
اور مولانا محمد علی صاحبان اور دیگر اصحاب نے تائید کی۔

مفتی صاحب نے تائیدی تقریر میں فرمایا کہ یہ ریزولیوشن ایک ایسے جلسہ کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ ہے۔ اسمیں ہر خیال اور ہر طبقہ کے مسلمان شریک ہیں۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو تسلیم کیا ہے اگر کوئی شخص ایسا کہے گا تو اس کا کہنا غلط ہوگا اور یہ طرز عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی سعی و کوشش کرے میں جمعیت علمائے ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں، تجویز مذکور حسب ذیل تھی:۔

ا۔ تجویز

جبکہ ہندوستان کی وسعت اور اسکی نسلی لسانی۔ انتظامی جغرافی یا ملکی تقسیمات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی حالات کے مطابق صرف وفاقی طرز حکومت ہے جسمیں ان ریاستوں کو جو اس وفاقی حکومت کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کامل خود مختارانہ اور فیصلہ کن اختیارات حاصل اور مرکزی حکومت کو صرف ان امور کے متعلق قطعی اختیارات حاصل ہوں۔ جو مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں اور دستور اساسی کی رو سے خاص طور سے اُسے تفویض کئے گئے ہوں .... اور.....

۲۔ جبکہ یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا مسودہ قانون، قرارداد تحریک یا ترمیم جو بین الملّی معاملات کے متعلق ہو کسی مجلس مقننہ خواہ وہ صوبہ دار ہو۔ یا مرکزی پیش نہ کیا جائے اگر اس ملت سے جس پر اس کا اثر پڑتا ہو۔ خواہ وہ ہندو ملت ہو یا مسلم ملت۔ تین چوتھائی ارکان کی اکثریت اس مجلس مقننہ میں اسکے پیش کرنے۔ اس پر بحث مباحثہ کرنے یا اس کو منظور کرنے کی مخالفت کریں .... اور ....

۳۔ جبکہ مسلمانوں کا یہ حق کہ مختلف ہندوستانی مجلس مقننہ میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ اپنے نمایندہ منتخب کریں ملک کا مروجہ قانون ہے۔ اور مسلمان اپنی اس حق سے بغیر اپنی رضامندی کے محروم نہیں کئے جاسکتے ...... اور ......

۴۔ جبکہ ان حالات کے ماتحت جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں اور جب تک یہ حالات موجود رہیں گے مختلف مجالس مقننہ اور دیگر آئینی خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں کی نیابت اپنے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ ضروری ہے تاکہ حقیقی نمایندہ جمہوری حکومت قائم کی جائے ...... اور ....

۵۔ جبکہ اسوقت تک جبتک کہ مسلمانوں کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ دستور اساسی میں اُن کے حقوق اور مفاد کی مناسب حفاظت کیگئی ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی اس پر رضامند نہ ہوں گے کہ خواہ مشروط یا غیر مشروط طریقہ پر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کئے جائیں .... اور ....

۶۔ جبکہ مذکورۃ الصدر مقاصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان مرکزی اور صوبہ جاتی کابینوں میں اپنا جائز حصہ حاصل کریں .... اور ....

۷۔ جبکہ یہ ضروری ہے کہ مختلف مجالس مقننہ اور آئینی خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں

کی نیابت ایک ایسے طریقہ پر مبنی ہو جس سے اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہے مسلمانوں کی اکثریت میں کسی صورت سے بھی فرق نہ آئے گا اور ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے کسی حالت میں بھی ان کی نیابت اس سے کم نہ ہوگی۔ جو ان کو موجودہ قانون کے ماتحت حاصل ہے ...... اور ....

۸۔ جبکہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی نمایندہ جمعیتوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر دیا ہے کہ ہندوستان میں بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں کے مفاد کے مناسب تحفظ کی غرض سے مرکزی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کو ½ ۳۳ فیصدی نیابت کا حق ملنا چاہیئے۔ اور یہ کانفرنس اس مطالبہ کی تائید کرتی ہے .... اور ....

۹۔ لسانی۔ نسلی۔ جغرافی اور انتظامی وجوہ کی بنا پر صوبہ سندھ بقیہ احاطہ بمبئی سے کوئی بھی مناسبت نہیں رکھتا اور اسکے باشندوں کے مفاد کے لحاظ سے اس کا غیر مشروط طور پر ایک ایسا علیحدہ صوبہ بنانا جس میں ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح اپنا علیحدہ نظام حکومت اور مجلس قانون ساز موجود ہو ناضروری ہے۔ ہندو اقلیت کو اسکے تناسب آزادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمایندگی دیدی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے جہاں انکی آبادی اقلیت میں ہو .... اور ....

۱۰۔ جبکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اس طریقہ پر جو ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اختیار کیا جائے۔ آئینی اصلاحات کا نفاذ نہ صرف ان صوبوں کے مفاد کے خیال سے بلکہ بحیثیت مجموعی تمام ہندوستان کی آئینی ترقی کے لحاظ سے بھی ضروری ہے ان صوبوں کی ہندو اقلیتوں کو اُن کے تناسب آبادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمایندگی دیدی

جائے۔ جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دیجا سکتی ہے۔ جہاں کہ انکی آبادی اقلیت میں ہو۔ .... اور ....

۱۱۔ جبکہ انتظام ہندوستان کے مفاد کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں ایسا بندوبست کیا جائے۔ جس کی رو سے سرکاری اور آئینی خود مختار انجمنوں کی ملازمتوں میں اہلیت کے واجبات کا مناسب لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ مناسب حصہ دیا جائے .... اور ....

۱۲۔ جبکہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی معاشی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے دستور آساسی میں مسلمانوں کے تمدن کے تحفظ اور مسلمانوں کی تعلیم زبان مذہب شخصی قانون اور مسلمانوں کے خیراتی ادارات کے تحفظ اور ترقی سرکاری امداد میں انکے مناسب حصہ کے لئے مناسب تحفظ شامل کئے جائیں ..... اور .....

۱۳۔ جبکہ یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں یہ قرار دیا جائے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں اسکے نفاذ کے بعد کوئی تغیر و تبدل اسوقت تک نہیں کیا جائیگا جبتک کہ وہ تمام ریاستیں جن پر ہندوستانی وفاقی حکومت (انڈین فیڈریشن) مشتمل ہو متفقہ اس کی خواہش نہ کریں گی۔ ....

یہ کانگریس نہایت زور کیساتھ اعلان کرتی ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان کسی دستور اساسی کو خواہ اسکو کوئی مرتب کرے۔ یا تجویز کرے۔ اسوقت تک قبول نہیں کرینگے جبتک وہ ان اصولوں کی تصدیق نہ کرے جو اس تجویز میں پیش کئے گئے ہیں۔

اسکے بعد لیگ کونسل کی میٹنگ منعقد ہوئی اور بڑے غور و مباحثہ کے بعد مسٹر جینا کے حسب ذیل چودہ نکات وجوہ پذیر ہوئے جو مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ قرار پایا۔

(۱) آیندہ دستور کی ترتیب فیڈرل ہونی چاہیئے جسمیں کہ صوبہ جاتی خود مختاری بھی شامل ہے (۲) تمام صوبہ جات کو ایک ہی قسم کی خود مختاری ملیگی (۳) ملک میں جسقدر مجالس قانون ساز اور ایسے دوسرے ادارے ہیں جنمیں نمایندگی ہوتی ہے تو انمیں اقلیتوں کی موثر اور ضرورت کے مطابق نمایندگی ہوگی بغیر اسکے کہ اس صوبہ کی اکثریت کو اقلیت یا برابری میں تبدیل کر دیا جائے (۴) مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت ⅓ سے کم نہ ہوگی۔ (۵) جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے فرقہ دارانہ نیابت جاری رہے گی جیسا کہ اب ہے لیکن یہ امر ہر فرقہ کی مرضی پر ہوگا کہ وہ کسی وقت جداگانہ انتخاب کے بجائے مخلوط انتخاب قبول کرے (۶) اگر کسی وقت حدود میں تبدیلی کیجائے تو کسی صورت میں پنجاب بنگال، سرحد کے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت پر اثر نہ پڑنے دیا جائیگا (۷) تمام فرقوں کی مذہبی امور میں آزادی کامل یعنی عقیدہ اور عبادت کی آزادی، اور ادائیگی فرض میں تمام رسوم کی آزادی، پروپاگنڈا، ایسوسی ایشن اور ایجوکیشن کی آزادی کی ذمہ داری ہوگی، (۸) کوئی بل یا رزولیوشن یا اس سے متعلق کوئی امر کسی مجلس قانون ساز میں یا کسی ادارہ میں جہاں نیابت اور انتخاب سے لوگ گئے ہوں پاس نہوگا جس کی ¾ ممبر کسی ایک فرقہ کے اس بنا پر مخالفت کریں کہ وہ اس فرقہ کے مفاد میں بہت زیادہ مضر اور نقصان رسان ثابت ہوگا، یا بصورت دیگر کوئی ایسا حل یا طریقہ جو ان حالات سے مطابقت کے لئے ممکن اور قابل عمل ہو معلوم یا منظور کر لیا گیا ہو۔ (۹) سندھ بمبئی پریسیڈنسی سے علیحدہ ہوگا (۱۰) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات اسی پیمانہ پر ہونگی جیسی کہ دیگر صوبجات میں (۱۱) قانون میں اس امر کا لحاظ و گنجایش رکھی جائیگی کہ مسلمانوں کو دوسرے ہندوستانیوں کیساتھ حکومت اور لوکل سیلف گورنمنٹ پاڈیٹیر کی تمام ملازمتوں

میں مناسب حصہ دیا جائے، لیکن قابلیت و استعداد کا مناسب خیال رکھا جائیگا۔

(۱۲) قانون میں کافی تحفظ مسلمانوں کے کلچر کا ہونا چاہیے نیز مسلمانوں کی تعلیم زبان مذہب پرسنل لا اور اُنکے خیراتی اداروں کا تحفظ اور انکی ترقی کا لحاظ ہوگا اور جو مدد کہ حکومت یا لوکل سیلف گورننگ باڈیز سے دیجاتی ہے اسمیں انکا مناسب حصہ ہوگا۔

(۱۳) کسی کابینہ کی خواہ صوبجاتی ہو یا مرکزی اسوقت تک تشکیل نہوگی جب تک کہ اسمیں ⅓ مسلم وزرا نہ ہوں (۱۴) مرکزی مجلس قانون ساز سے کوئی تبدیلی فیڈرل قانون میں نہوگی جب تک کہ ان ریاستوں کی منظوری و مشورہ شامل نہو جو اسمیں شریک ہوں،

باب ششم

سلسلہ اصلاحات میں حکومت کی طرف سے ۱۹۲۴ء میں ایک کمیٹی کی تشکیل کیگئی تھی جسکے صدر سر الگزینڈر مڈیمن تھے اور ممبران مہاراجہ بردوان۔ ڈاکٹر سر سپرو۔ سر سوامی آئر ڈاکٹر پرانجپائے۔ میاں سر محمد شفیع اور مسٹر محمد علی جناح تھے اس کمیٹی کی مجارٹی اور منارٹی رپورٹوں میں باوجود اختلاف اس نقطہ پر اتفاق تھا کہ فرقہ وارانہ انتخاب ۹۱ قایم رکھا جائے۔ پھر سائمن کمیشن ۹۲ کے سامنے جسقدر رپورٹیں پیش ہوئیں ان سب میں فرقہ وارانہ انتخاب کی حمایت کیگئی سنہ ۱۹۳۰ء میں لارڈ ارون نے حکومت ہند کی طرف سے جو مراسلہ وزیر ہند کو بھیجا۔ اسمیں بھی یہ امر واضح کردیا کہ یہ رعایت (جداگانہ انتخاب) جو اسوقت مسلمانوں کو حاصل ہے ان

---

۹۱ اسی کمیٹی کے سامنے ۱۸ اگست کو مسٹر چینتامنی سابق وزیر حکومت صوبہ متحدہ و اڈیٹر اخبار لیڈر نے اپنی شہادت میں انتخاب جداگانہ کی حمایت کی تھی۔

۹۲ سائمن کمیشن کا زبردست مقاطعہ کیا گیا مسلم لیگ بھی اس مقاطعہ میں شریک تھی لیکن وہ اپنا کام کرتا رہا۔

کی مرضی کے خلاف نہ واپس لیجاسکتی ہے نہ لینی چاہیئے۔ تمام مسلمان سیاسیین و ادارات اپنے مطالبات پر برابر زور دیتے اور ہندوؤں کی طرف سے جو بے اطمینانی و بے اعتمادی تھی اسکو علی الاعلان ظاہر کرتے رہے۔ مسلمانوں کے علاوہ اور بھی حسب ذیل پانچ اقلیتیں طالب حقوق تھیں (۱) سکھ (۲) اچھوت (۳) برطانوی تجار (۴) اینگلو انڈین۔ (۵) دیسی عیسائی اور ملک معظم قیصر ہند کے اعلان میں تمام اقلیتوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا گیا تھا۔

نوٹ (۱) ۱۹۲۱ء کے دستور میں سکھوں کو نیابت مل گئی تھی اس موقع پر بھی بلند آہنگی کے ساتھ انھوں نے اپنے مطالبات پیش کئے۔ ان کی آبادی کل پنجاب اور دیسی ریاستوں میں پوری آبادی کا ۱/۲ حصہ ہے۔

(۲) اچھوت ۳۵۰۰۰۰ ہم کی تعداد میں ہیں اس سے قبل وہ ہندو قوم میں شامل تھے لیکن تعلیم نے ان میں اپنی ذلت یا اونچی ذات والوں کے مظالم کا احساس پیدا کردیا اور حکومت کی دستگیری اور اپنی جد و جہد سے انھوں نے پست اقوام کے نام سے تعلیمی و سیاسی مراعات حاصل کیں۔ ۱۹۲۱ء سے اسمبلی صوبجاتی کونسلوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلیٹیوں میں لازمی طور پر ان کی نامزدگی ہونے لگی۔

(۳) برطانوی تجار کو ۱۸۸۳ء سے حق نمایندگی حاصل تھا جو بتدریج ترقی کرتا رہا۔

(۴) اینگلو انڈین کی آبادی کم و بیش ایک لاکھ ہوگی مگر انھوں نے بھی اپنے لیے نشستیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔

(۵) دیسی عیسائی حقیقت میں ہندوؤں کی نیچ ذاتوں کا حصہ ہے اور تقریباً ساڑھے چار کروڑ آبادی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں ان کا وجود بطور فرقہ خاص تسلیم کیا گیا۔

صوبہ مدراس میں حلقہ ہائے انتخاب جداگانہ بنائے گئے اور باقی صوبوں اور اسمبلی میں نامزدگی سے نشستیں مخصوص رکھی گئیں۔

۱۳ر نومبر ۱۹۳۰ء کو جب ہندوستانی سیاسیین پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تو انکے پاس کوئی فرقہ دارانہ مصالحت کا حل نہ تھا اور ایک دوسرے کیساتھ بے اعتمادی تھی۔ مگر اس کانفرنس کی میناریٹی سب کمیٹی کی پہلی ہی نشست میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ چیرمین نے اس مسئلہ کی اہمیت پر زور دیا کہ اقلیتوں کی مصالحت کا سوال ہندوستان کی سیاسی ترقی کیلئے ضروری ہے اور یہ نظریہ صرف انگریزوں کا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہر روشن دماغ ہندوستانی کا ہے اور یہ ایک ایسا سوال ہے جو آپسمیں ہی طے ہوجانا چاہیئے۔ یہ اچھی بات نہیں کہ آپ ہندوستان کا ایک دستور وضع کریں اور کسی بیرونی اتھارٹی سے خواہشمند ہوں کہ وہ ایسے ضروری مسئلہ کو طے کردے کہ جو اس دستور پر کامیابی کیساتھ عمل پیرا ہونے کی شرط اولین ہو دسمبر کی میٹنگ میں اچھوتوں اور دیسی عیسائیوں کے نمائندوں نے فرقہ دارانہ انتخاب و نمائندگی پر سخت اصرار کیا۔ مسلمانوں کے اقل قلیل مطالبات وہی تھے جو ۱۹۲۹ء میں مرتب کئے گئے تھے تمام اقلیتوں نے متفقہ طور پر اس امر کو ظاہر کردیا کہ ہندوستان کیلئے سیلف گورننگ کانسٹیٹیوشن (دستور حکومت خوداختیاری) صرف اس صورت میں قابل قبول ہے کہ انکے مدلل مطالبات مان لئے جاویں جنمیں سب سے اہم مطالبہ انتخاب جداگانہ ہے۔ اس مسئلہ پر مسلمان اور دیگر تمام اقلیتوں میں کامل اتفاق تھا۔ اور وزیراعظم نے بھی ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی کانفرنس کے اختتام پر اپنے اعلان میں اس امر کا اظہار کیا کہ دستور اساسی کی ترتیب میں ملک معظم کی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اس قسم کے شرائط رکھے جن سے اقلیتوں کے لئے سیاسی نمائندگی کے علاوہ اسکی ضمانت ہوجائے کہ صرف مذہب، نسل، فرقے یا ذات کے اختلاف کی بنا پر کوئی شخص مدنی حقوق

سے محروم نہ کیا جائے گا۔

ملک معظم کی حکومت کے نزدیک مختلف فرقوں کا یہ فرض ہے کہ جو مسائل اقلیتوں کی سب کمیٹی میں چھوڑے تھے۔ اگر طے نہوں تو آپسمیں کوئی تصفیہ کرلیں اس گفت و شنید کے سلسلہ میں جو اسکے بعد ہوگی یہ تصفیہ ہو جانا چاہیئے۔ اور حکومت اس معاملہ میں جو کچھ مدد کرسکتی ہے کرتی رہیگی۔ کیونکہ اسے نہ صرف اسکی فکر ہے کہ نیا دستور اساسی جلد سے جلد جاری ہو جائے بلکہ اس بات کی بھی ہے کہ اس کا آغاز تمام فرقوں کی رضامندی اور اعتماد کے ساتھ ہو۔

ہندوستان میں گاندھی ارون پیکٹ کے بعد فرقہ وارانہ تصفیہ کیلئے پوری کوشش کی گئی۔ مسٹر گاندھی نے مسلم مطالبات کو صرف اس صورت میں منظور کرنیکا وعدہ کیا کہ کانگریسی مسلمان بھی جو معدودے چند تھے۔ ان سے اتفاق کرلیں۔ یہ قلیل جماعت مخلوط انتخاب کی موید تھی مگر چونکہ مسلمانوں کی اہم اکثریت انتخاب جداگانہ کی حامی تھی اسلئے مصالحت نہو سکی اور مسٹر گاندھی جب دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے تو مختلف مباحثہ کے دوران میں انہوں نے اقلیتوں کے مطالبات کے متعلق جو روش اختیار کی اسنے فضا کو بہت زیادہ مکدر کردیا۔ ویسی عیسائیوں اور اچھوتوں کے لیڈروں نے ان پر بے اعتمادی کا اظہار کیا اور نزاکت حالات بڑھ گئی۔ ایسے ہی ایک نازک موقع پر مسٹر نائیڈو اور سر شفیع کی صلح جویانہ تقریروں نے ایک سکون کی حالت پیدا کی مسز نائیڈو نے کہا کہ "ہمیں کسی اقلیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے مجھے اس وقت وہ نصیحت یاد آتی ہے جو دو سال ہوئے کہ یورپ کے ایک بڑے سیاست داں نے کی تھی کہ تم کو اپنی اقلیتوں کو خوش رکھنا چاہیئے یاد رکھو کہ تم جب تک اپنی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری نہ کرلو۔ ایک قوم کی تشکیل نہیں کرسکتے"

ڈاکٹر سر سپرو اور رائٹ آنریبل سری نواس شاستری نے اس فیصلہ کیلئے تین یا پانچ ممبروں کی ایک کمیٹی قائم کئے جانیکی تجویز پیش کی اور مسٹر گاندھی کے استفسار پر ہز ہائنس آغاخاں نے اس کمیٹی پر مسلمانوں کا اتفاق بھی ظاہر کردیا۔ جس سے فیصلہ کی اُمید پیدا ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالویہ کو تشویش پیدا ہو گئی۔ اور ڈاکٹر مونجے نے بتائید راجہ نریندر ناتھ و سردار اجل سنگھ اعلان کردیا کہ جہاں تک فرقہ وارانہ مسئلہ کا تعلق ہے ہم کو اعتبار نہیں خود گاندھی جی نے اقلیتوں کی کمیٹی کے آخری اجلاس میں تسلیم کیا کہ اپنی ذات سے تو میں مسلمانوں کو سب کچھ دینے کو تیار ہوں جو وہ چاہتے ہیں۔ اور میں رات کو پچھلے پہر تک ہندوؤں اور سکھوں کو آمادہ کرتا رہا کہ میرا ساتھ دیں مگر مجھے ناکامی ہوئی۔

ہز ہائنس آغاخاں نے مسلمانوں کی طرف سے مسٹر گاندھی کو یہ یقین بھی دلایا کہ وہ ہر صورت میں کانگریس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ ان کے تحفظ حقوق کی ذمہ داری کی جائے۔

مسٹر گاندھی نے ذاتی حیثیت سے چودہ نکات اور انتخاب جداگانہ کو بایں شرط منظور کرلیا کہ مسلمان دیگر اقلیتوں کی جداگانہ مخالفت میں کانگریس کی مدد کریں۔ بجز سکھوں کے اور ایسے ہندوؤں کے جو اپنے صوبوں میں اقلیت رکھتے ہوں۔ مگر اس شرط کو ماننے سے انکار کردیا گیا۔ اور اس کو نہایت ذلت آمیز تصور کیا کہ وہ ایسی ذلیل شرط پر ان اقلیتوں کی رفاقت ترک کردیں۔ جن کیساتھ کہ وہ پورا اتفاق اور سمجھوتہ کر چکے ہیں۔

ان تمام اقلیتوں نے مسٹر گاندھی اور مہا سبھائیوں کے رویہ سے مایوس ہو کر باہمی معاہدہ کیا اور جب ۱۳ / نومبر ۱۹۳۱ء کو مینارٹی کمیٹی کی آخری نشست ہوئی تو وزیر اعظم نے ایک زوردار

تقریر کی جسمیں کہا کہ "ہندوستان کے کسی نئے دستور کیلئے سب سے پہلے فرقہ وارانہ نمائیندگی فرقہ وارانہ حقوق اور انکے تحفظ کے مسئلہ کا طے ہونا ضروری ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ آپ بھی اس سے انکار نہ کرینگے کہ بغیر کسی بنیاد کے کوئی قانون بھی وضع نہیں کیا جاسکتا" اسکے بعد ہز ہائنس آغا خاں نے مینارٹیز پیکٹ پیش کیا جو تمام اقلیتوں کی باہمی مفاہمت سے مرتب ہوا تھا اسکو پیش کرتے ہوئے ہز ہائنس نے کہا کہ یہ معاہدہ بہت ہی غور و فکر کے بعد اس مشکل اور پیچیدہ مسئلہ کے متعلق طے ہوا ہے اور اسکو سب کا پورا پورا متفقہ راضی نامہ سمجھنا چاہیئے اس معاہدہ کی تمام دفعات ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور اگر وہ نامنظور کیا جائے تو کلیتہً اور اگر منظور ہو تو کلیتہً ہونا چاہیئے۔

اس پیکٹ کے پیش ہونے کے بعد تمام اقلیتوں کے نمائیندوں نے مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا اسکے بعد ہندوؤں نے وزیر اعظم سے فیصلہ کی درخواست کی پنڈت مالویہ ڈاکٹر مونجے اور دوسرے ہندو لیڈروں نے انکی خدمت میں متحدہ اپیل کی کہ وہ خود فرقہ وارانہ فیصلہ کردیں مسٹر گاندھی نے بھی اسکی تائید میں ایک جداگانہ خط لکھا کہ ہر ایسے فیصلہ کی جس پر متعلقہ پارٹیاں متحد ہوجائیں کانگریس حمایت کریگی لیکن مسلمانوں نے اس درخواست پر اس بنا پر دستخط کرنے سے انکار کردیا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ ایسے اندرونی فرقہ وارانہ

(نوٹ) مینارٹی کمیٹی کی تقریر میں مسٹر گاندھی نے یہ بھی کہا کہ دوسرے اقوام نے جو مطالبات پیش کئے ہیں ان کو سمجھ سکتا ہوں لیکن اچھوتوں کیطرف سے جو مطالبات پیش ہوئے ہیں وہ بہت زیادہ دکھ پہونچانیوالے ہیں۔ ہم اچھوتوں کو ہرگز ہرگز علیحدہ کرنا نہیں چاہتے سکھ الگ رہ سکتے ہیں اور اسیطرح مسلمان اور عیسائی بھی کیا اچھوت اچھوت ہی رہینگے وہ لوگ جو اچھوتوں کے سیاسی حقوق کے متعلق گفتگو کرتے ہیں وہ ہندوستان اور اسکی سوسائٹی کے حالات کو نہیں جانتے اور میں یہاں اپنی پوری طاقت سے کہدینا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے تن تنہا اپنی زندگی سے بھی اسکی مزاحمت کرنی پڑے تو کروں گا۔

مسئلوں کا فیصلہ کرے جو کہ باہمی سمجھوتہ سے فیصل نہو سکیں اور دوسری اتھارٹی اسبات کا حق رکھتی ہے کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ صادر کر سکے یا اس پر عمل کرنے کیلئے زور دے سکے۔

ان ہی طے شدہ مباحث کیساتھ گول میز کانفرنس کا اجلاس ختم ہو گیا اور آخری دن یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم نے جو مبسوط بیان دیا اسمیں فرقہ وارانہ مسائل کی گتھی نہ سلجھنے پر افسوس کا اظہار کیا اور اسکو ترقی کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ قرار دیکر کہا کہ اس صورت میں ملک معظم کی حکومت اس امر پر مجبور ہو گی کہ ایک عارضی تجویز پر عمل کرے۔ کیونکہ اسنے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس دقت کو بھی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے دیگی اسکے معنی یہ ہیں کہ ملک معظم کی حکومت نہ صرف آپکی نمایندگی کے مسائل کا تصفیہ کریگی بلکہ جہاں تک ممکن ہو دانش مندی اور انصاف کیساتھ یہ بھی طے کر دیگی کہ اصول جمہوریت کے بے قید اور خلاف انصاف استعمال سے جسکی بدولت اکثریت کو کل اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں، اقلیتوں کو محفوظ رکھنے کیلئے دستور اساسی میں روک تھام کی کیا کیا صورتیں ہونی چاہئیں۔ یہ میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ اگر حکومت کو عارضی طور پر بھی آپ کے دستور کا یہ حصہ مرتب کرنا پڑا جو آپ خود نہیں کر سکتے تو باوجود اسکے کہ وہ پورے اہتمام سے اقلیتوں کے لئے کافی تحفظات رکھے گی۔ تاکہ ان میں سے کسی کو بے توجہی کی شکایت نہ رہے۔ یہ اس مسئلہ کے حل کرنیکی قابل اطمینان صورت نہ ہو گی۔ یہ بھی سن لیجئے کہ اگر اس معاملہ میں آپ کے آپسمیں کوئی تصفیہ نہ ہوا تو یہاں پر حکومت کو جو ہندوستان کے دستور اساسی کے بارہ میں ہمارے ہم خیال ہو بڑی مشکلیں پیش آئیں گی اور اسکی وجہ سے آپ کے دستور کا مرتبہ دوسرے ملکوں کے دستور سے گھٹ جائیگا۔ اسلئے میں ایک بار پھر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپس میں گفتگو کر کے جو موقع ملیں ان سے فائدہ اٹھائیے اور کوئی فیصلہ کر کے ہمارے سامنے پیش کیجئے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کا وہ حل جس کا تعلق صرف

کونسلوں کی نمائندگی سے ہو ان حقوق کی حفاظت کیلیے کافی نہیں۔ جن کو میں فطرتی حقوق کہتا ہوں جن شرائط کا ذکر ہو چکا ہے ان کے بعد بھی اقلیتیں بدستور اقلیتیں رہینگی اس دستور اساسی میں ایسی دفعات کی ضرورت ہے جن سے ہر عقیدہ اور طبقہ کے لوگوں کو پورا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت کی حکومت اس طرح استعمال نہیں کی جائیگی کہ جس سے انہیں ہئیت سیاسی کے اندر اخلاقی یا مادی نقصان پہونچ جائے حکومت اسوقت یہ تصریح نہیں کر سکتی کہ اسکے لیے کیا شرطیں ہونا چاہئیں۔ ان کی نوعیت اور انکے دائرہ کو معین کرنے کے لیے بہت کچھ غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف تو اسکا یقین ہو کہ وہ اپنا مقصد پورا کرنے کیلیے کافی نہیں اور دوسری طرف یہ اطمینان ہو کہ وہ سیاسی ذمہ دارانہ حکومت کے اصولوں میں اس حد تک مداخلت نہیں کرتی کہ انہیں باطل کر دیں۔ اسمیں مشاورتی کمیٹی کو خاص طور پر دخل ہونا چاہیے۔ کیونکہ نشستوں کے تناسب اور طریق انتخاب کے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی دستور کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ اس کی ترتیب باہمی مفاہمت کی بنیاد پر ہو۔

نتیجہ میں ملک معظم کی حکومت نے دستور جدید میں کمیونل ادارڈ کے نام سے فرقہ دارانہ فیصلہ کر دیا اور جداگانہ انتخاب کا اصول بایں شرط قایم کیا گیا کہ باہمی رضامندی سے دس سال کے بعد تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

بنگال اور پنجاب میں نشستوں کی تقسیم نہایت اہم ہے۔ لیکن ان صورتوں میں مسلمانوں کے تناسب آبادی سے تقریباً (۷) فیصدی کم نشستیں ملیں۔

مذکورہ بالا واقعات کے متعلق جو گول میز کانفرنس میں پیش آئے مئی ۱۹۳۵ء میں (مرحوم) خان بہادر حاجی حافظ ہدایت حسین، بار ایٹ لا نے ایک بیان شائع کیا تھا جو اس سلسلہ میں

قابل لحاظ ہے وہ کہتے ہیں کہ مسٹر ستنامورتی نے حال میں سرکاری فرقہ وارانہ حل کے متعلق جو بیان شائع کیا ہے اسکے متعلق میں چند واقعات پر جو کہ حل مذکورہ سے پیشتر رونما ہونے تھے روشنی ڈالنے کی جرأت کرتا ہوں - ۲۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اقلیتوں کی میٹنگ میں ممبران سے جن میں مہاتما گاندھی بھی شامل تھے اپیل کی تھی کہ اس پیچیدہ مسئلہ کو حل کریں - پنڈت مدن موہن مالویہ اور ہز ہائینس سر آغا خان کی درخواست پر میٹنگ ایک ہفتہ کیلئے ملتوی کر دی گئی - بعد ازاں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مسئلہ کو حل کرنیکے بعد ہر طبقہ کے دو - دو - تین - تین ممبران پر مشتمل ایک چھوٹی کمیٹی مقرر کیجائے ۸ - اکتوبر سے ۱۲ - اکتوبر تک مہاتما گاندھی کی صدارت میں اس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا - لیکن بالآخر کمیٹی نے اپنی ناکامی کا اظہار کیا - ایک ہفتہ کے التواء کے بعد اقلیتوں کی کمیٹی کا پھر اجلاس منعقد ہوا اور وزیر اعظم سے پھر اپیل کی کہ ایک مرتبہ اور اسے حل کرنیکی کوشش کیجائے - چنانچہ پھر گفت و شنید شروع ہوئی اسکی خاص وجہ یہ تھی کہ مہاتما گاندھی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی سرحد میں ہندوؤں کو اقلیت فرقہ تسلیم کرنے کیلئے تیار تھے لیکن انکے علاوہ اور کسی کو بھی اقلیت تسلیم کرنا پسند نہیں کرتے تھے علاوہ بریں اسی شرط پر گفت و شنید کرنا چاہتے تھے کہ عیسائی - اینگلو انڈین اور یورپینوں کو ہندوستان کا باشندہ تسلیم کیا جائے دیگر اقلیتوں نے اس اثنار میں باہمی گفت و شنید کے ذریعہ ایک سمجھوتہ کر لیا ٹائمز نے بھی اسکی حمایت کی مہاتما گاندھی کو اس سے بڑی پریشانی ہوئی - اسکے بعد اقلیتوں کی کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی مہاتما گاندھی نے اس سمجھوتہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور کہا کہ وہ لوگ مردہ کی چیر پھاڑ کی کوشش کر رہے ہیں - وزیر اعظم نے میٹنگ ملتوی کرتے ہوئے ممبران سے کہا کہ وہ اپنے دستخطوں سے انکے پاس ایک درخواست بھیجیں اور اسمیں یہ

وعدہ کریں کہ ہم خود فرقہ وارانہ مسئلہ کو جس طرح حل کردیں گا اسکو وہ تسلیم کریں گے۔ ۴ نومبر کو مہاتما گاندھی نے مسلم ڈیلیگیٹوں سے ملاقات کی اور ان کو اس سمجھوتہ سے توڑنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے انکار کردیا۔ اسی دن پنڈت مدن موہن مالویہ نے وزیر اعظم کو ایک خط لکھا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ کا تصفیہ کریں۔ اس خط پر مہاراجہ دربھنگہ شریمتی سروجنی نائیڈو مسٹر نریندرناتھ ڈاکٹر مونجے سیٹھ برلا مسٹر جیکر اور مسٹر آئینگر کے بھی دستخط تھے۔ جب یہ خط بھیجا گیا اسوقت مہاتما گاندھی نے بھی وزیر اعظم کو ایک چٹھی لکھی جسمیں اُنہوں نے یہ واضح کیا کہ پنڈت مالویہ کی چٹھی پر میرے دستخط نہ کرنے کے یہ معنی اخذ نہیں کرنا چاہئیں کہ کانگریس آپ کے فیصلہ کی مخالفت کریگی۔ اسکے بعد سر تیج بہادر سپرو رائٹ آنریبل سر نیواس شاستری۔ سر چمن لال سیتلواڈ۔ سر اے۔ پی پیٹرو اور فیروز سیٹھنا نے بھی وزیر اعظم کو چٹھیاں لکھیں۔ ان تمام چٹھیوں میں اس بات کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا کہ کانگریس اس فیصلہ کی پابند نہیں ہوگی لہذا اب یہ کہنا بیکار ہے کہ کانگریس سرکاری فرقہ وارانہ حل کی پابند نہیں ہے۔

مسٹر عبدالرحمن صدیقی (سندھی) ایم ایل سی بنگال کونسل اُن اصحاب میں ہیں جو کانگریس کے مسلم زعما سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے خاص رفقا میں ہیں، اور راونڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانہ میں لندن میں موجود تھے انہوں نے اگست ۱۹۳۷ء میں بمقام سورت ایک پبلک اسپیچ میں کہا ہے کہ مسٹر گاندھی نے انگلستان میں راونڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانہ میں خود وزیر اعظم کو اپنی رضامندی دی تھی۔ مگر فرقہ وارانہ سوال کے واقعہ کو ہندو پریس نے کلیتہ دبا دیا اور قطعاً نہ اُبھر سکا۔

ان ہی کوششوں کے متعلق ڈاکٹر سپرو کا بیان ہے کہ :-

"انہوں نے (گاندھی جی) ۲۷ یا ۲۸ اشخاص کا ایک جلسہ طلب کیا جو قصر سینٹ جیمس میں ہر رات جمع ہوتے تھے اس تمام کارروائی میں وہ (گاندھی جی) بے حد آرزو مند تھے کہ کوئی مفاہمت ہو جائے اگر میں بعض ان حضرات کے طرز عمل کا تذکرہ کروں جنہوں نے اس جلسہ کی تمام کارروائیوں میں حصہ لیا تھا تو یہ گویا مسئلہ کے بہت ہی نازک پہلو کا اظہار ہو گا ان کارروائیوں کی سچی اور مکمل تاریخ تو ابھی لکھی جانی باقی ہے لیکن میں یہ بلا خوف و تردد بیان کروں گا کہ اس آخری رات کو جب جلسہ ہوا تو ذہنی اضطراب کے آثار اُن کے (گاندھی جی) چہرے سے عیاں تھے۔ ہم بغیر کچھ حاصل کئے ہوئے اُٹھے اور اسوقت ایران کے شاعر اعظم فردوسی کا وہ قول یاد آگیا جو اس نے تاریخ ایران کے ایک مشہور واقعہ کے متعلق کہا تھا "نشستند و گفتند و برخاستند" میں نے اس تاثر کو اپنی ڈائری میں اسی وقت قلمبند کیا ممکن ہے کہ وہ کسی قدر جذباتی رنگ لئے ہوئے ہو لیکن آج چار سال بعد نیز ان چار سالوں میں جو کچھ میں نے دیکھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اسوقت میں کسی مخالفانہ جذبہ سے مغلوب ہو گیا تھا اس کا اندراج اس طرح ہے :-

"نام نہاد ہندوستانی قومیت کا جنازہ نکلتے دیکھا جس کے مخصوص کندھا دینے والوں میں . . . . تھے کیا پھر وہ زندہ بھی ہو گی"

تصفیہ باہمی میں تمام ناکامیوں کے بعد ۱۹۳۱ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس نے بنیادی حقوق کے نام سے ایک قرارداد پاس کی جس میں یہ امر واضح کیا گیا کہ "ہر باشندہ ہند کو ضمیر کی آزادی حاصل ہو گی۔ اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکیگا اور وہ

اپنے فرایض و رسوم آزادی سے ادا کر سکیگا بشرطیکہ اس سے انتظام عامہ اور اخلاق عامہ میں کوئی نقص واقع نہو ملک کی اقلیتوں کے تمدن زبان رسم الخط محفوظ ہونگے نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو باعتبار اختلاف زبان" قائم ہیں ان کا تحفظ ہوگا"

"ہندوستان کے تمام باشندے بلا امتیاز مذہب و ملک یا ذات و قوم یا جنسیت قانون کی نظر میں برابر ہوں گے، ہندوستان کا کوئی باشندہ خواہ مرد ہو یا عورت اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کی وجہ سے یا کسی تجارت یا پیشہ سے ممنوع نہیں سمجھا جائیگا۔ مذہب کے معاملہ میں حکومت غیر جانب دار رہیگی۔ رائے دینے کا حق ہر عاقل و بالغ کو ہوگا" مگر اس مبہم قرارداد سے کوئی بھی مطمئن نہ ہوا۔

باب ہفتم

کمیونل اوارڈ کے قرطاس ابیض میں شایع ہونے کی بعد مابعد اس پر غور کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۳۳ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جسکے صدر راجہ سید احمد علیخاں علوی آف سلیم پور تھے۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں ان مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی جس کا اہم اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میں سے کوئی صاحب اقلیت کے اس حق سے انکار نہ کرینگے کہ وہ ملک کے آئین میں اپنے لئے کچھ تحفظات کا مطالبہ کرے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ تمام حضرات اس معاملہ میں میری تائید کرینگے کہ تمدنی تحفظات کو جن میں زبان اور رسم الخط کے مسائل بھی شامل ہیں دیگر تحفظات پر فوقیت حاصل ہے ہندوستان کے مسلمان ایک خاص تمدن کے حامل ہیں جو اسوقت بھی اُن کی ایک شان امتیازی ہے اور اس تمدن

کو وہ دل سے عزیز رکھتے ہیں۔ اور جان کے ساتھ حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ اسکے لئے جب تک آئینی تحفظات نہ ہوں اُس وقت تک مسلمانوں کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہے کہ اُنکی انفرادیت کسی ایسی چیز میں جذب ہو جائیگی جسے وہ اپنی ملی مفاد کیلئے مفید نہیں سمجھتے آل انڈیا مسلم کانفرنس نے ۱۹۲۹ء میں ایک قرارداد کے اندر یہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ :- "ہندوستان کے موجودہ معاشرتی اور سیاسی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے تمدن کے تحفظ اور مسلمانوں کی تعلیم، زبان، مذہب شخصی قانون اور مسلمانوں کے خیراتی اداروں کے تحفظ او ترقی اور سرکاری امداد میں اُن کے مناسب حصے کے لئے مناسب تحفظات شامل کئے جائیں۔

تحفظات کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہے حتیٰ کہ نہرو رپورٹ اور سائمن کمیشن نے بھی اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا البتہ دونوں نے واقعی ضروریات کو توڑ مروڑ کر بالکل مبہم اور بے نتیجہ شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ نہرو رپورٹ نے مجالس قرنی کے مسئلہ پر غور کیا۔ لیکن ان کے بروے کار لانے کی تجویز کو مسترد کر دیا اور ہندوستانی زبان کو تو ملک کی مشترکہ زبان بنانے پر زور دیا لیکن رسم الخط کے مسئلہ کو نہایت چالاکی سے گول کر دیا دوسری طرف سائمن کمیشن نے یہ رائے دی کہ "اس معاملہ میں تحفظ کی بہترین شکل یہ ہے کہ گورنر جنرل اور گورنران صوبہ کو اس معاملہ میں بروے کار لانیکے لئے امتیازی اختیارات دیدیے جاویں" لیکن اسی سائمن کمیشن نے ایک دوسری جگہ اینگلو انڈین طبقہ کے ایسے ہی مطالبہ کو اس سے زیادہ وزن دیا ہے اور اس مقصد کیلئے ایک خاص بورڈ کی تشکیل کی سفارش کی ہے۔

سر چمن لال سیتلواد نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مائناریٹیز کمیٹی میں

ایک یادداشت بھیجی تھی اُس میں لکھا تھا کہ :-

"اصل اس معاملہ میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ اقلیتوں کے لیئے کامل مذہبی آزادی اور تمدن و دستور کی حفاظت کی ضمانت کے لیئے مناسب تحفظات معین کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ایسے قوانین کی ضرورت ہے کہ ان کے مذہب وغیرہ کے خلاف کوئی قانون نہ بن سکے۔

انگلستان میں جو معاہدہ اقلیتوں کے مابین ہوا تھا اُس میں بھی ایک دفعہ بالفاظ ذیل موجود ہے :-

"آئین میں قلیل التعداد اقوام کے مذہب تمدن اور دستور کے تحفظ اور تعلیم زبان اور خیراتی اوقاف کی ترقی اور سرکاری اور بورڈ کی امداد میں اُن کے مناسب حصہ کے لیئے مناسب تحفظات ضروری ہیں"

لیکن مجھے افسوس ہے کہ جو مطالبہ اس شدومد کے ساتھ پیش کیا گیا اور جس کی اس طرح ہر چہار طرف تائید ہوئی۔ اُس پر قرطاس ابیض میں اتنی توجہ نہیں کی گئی جتنی چاہیئے تھی۔ اور ہم مسلمانوں کو اس پر مسلسل اصرار کرنے اور اسکے حصول کے لئے پوری قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے"

ملازمتیں

مسلمانوں کا ایک اور مطالبہ آل انڈیا مُسلم کانفرنس کے متذکرہ صدر ریزولیوشن کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

"انتظام ہندوستان کے مفاد کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں ایسا بندوبست کیا جائے جس کی رُو سے سرکاری اور آئینی خود مختار مجالس

کی ملازمتوں میں اہلیت کے واجبات کا مناسب لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ مناسب حصّہ دیا جائے"

لندن میں اقلیتوں کا جو معاہدہ ہوا تھا اُس میں اس مطالبہ کو بشکل ذیل تسلیم کیا گیا تھا:۔

"ہر صوبہ میں اور نیز مرکزی حکومت کے ساتھ ایک پبلک سروسز کمیشن کا تقرر کیا جائے۔ اور سرکاری ملازمتوں پر تقرر بجز اُن صورتوں کے جہاں یہ تقرر گورنر جنرل یا گورنر کی نامزدگی پر حصر ہو، اسی کمیشن کے توسط سے ہو، اور اس طرح ہو کہ مختلف اقوام کے افراد صحیح مناسب تعداد میں استعداد وغیرہ کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے لے جائیں۔

سائمن کمیشن اور راونڈ ٹیبل کانفرنس اور قرطاس ابیض میں دیگر مطالبات کی طرح اس مطالبہ کے ساتھ سلوک نہیں کیا گیا۔ اور قرطاس ابیض میں کچھ دفعات ایسی ہیں جن سے مسلمانوں کو اس معاملہ میں تھوڑا بہت تحفظ مل جاتا ہے۔ لیکن اِن دفعات کے الفاظ ایسے مبہم ہیں کہ ان پر نظر رکھنے کے لئے ایک سرکاری ادارہ کی ضرورت ہے۔ جو کمیشن مذکورہ اور مختلف سرکاری محکموں کی سرگرمیوں کی پڑتال کرتا رہے اور یہ اس کانفرنس کا کام ہے کہ اس قسم کی کوئی جماعت بنا دے۔

وزارتیں

اسکے علاوہ صوبہ جاتی اور مرکزی ایوانہائے وزارت میں مناسب نمائندگی

کا مطالبہ ہے۔ جو آل انڈیا مسلم کانفرنس کی قرارداد کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :۔

"مذکورالصدر مقاصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرکزی اور صوبہ جاتی وزارتوں میں مسلمانوں کو ان کا واجبی حصہ حاصل ہو"۔

لندن کے معاہدہ اقلیات میں اس مطالبہ کو بشکل ذیل تسلیم کیا گیا تھا۔

"مرکزی اور صوبہ جاتی حکومتوں میں ایوانہائے وزارت کی ترتیب کے وقت حتی الامکان مسلمان اور دیگر کافی تعداد رکھنے والے قلیل التعداد اقوام کے افراد کو شامل کرنے کی شرط آئین میں شامل ہونی چاہیے"۔

انڈین سنٹرل کمیٹی نے مسلمانوں کی اس خواہش کو تو قرین فطرت سمجھا اور نہرو رپورٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایک وزیر اعظم کا تقرر اس مسئلہ کو حل کریگا۔ اس لئے کہ وزیر اعظم دیگر اقوام کی خواہشات پر نظر رکھنے کے لئے مجبور ہوگا۔ سائمن کمیشن نے بھی اسی قسم کی تجویز پیش کی جیسی نہرو رپورٹ میں ہے لیکن قرطاس ابیض میں ذرا آگے قدم بڑھایا گیا۔ اور حسب ذیل دفعہ رکھی گئی۔

"دستاویز ہدایات میں گورنر پر اس قسم کی پابندی عائد کی جائیگی۔ کہ وہ اپنے وزراء کے تقرر میں اس بات کی پوری کوشش کریں کہ جو شخص ان کی نظر میں مجلس قانون ساز میں سب سے زیادہ اثر رکھتا ہو اس کے مشورہ سے ایسے افراد کا تقرر کریں (جن میں حتی الامکان قلیل التعداد اقوام کے نمائندے بھی شامل ہوں)، جو سب مل کر مجلس قانون ساز کا اعتماد حاصل کرسکیں۔

یہاں بھی مطالبہ کو ایسی مبہم شکل میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اسمیں کافی دیکھ بھال اور خبرداری کی ضرورت ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اس تحفظ کو جزو آئین بنایا جائے اور ہمیں اس کے لئے مسلسل اور اپنی پوری قوت کے ساتھ کوشش کرنا ہے۔

دیگر تحفظات

یہ اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر مسائل ہیں جن میں تحفظات کی ضرورت پر اس جلسہ میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا بہت سے مسائل کا میں نے ذکر نہیں کیا ہے۔ مثلاً ایک یہ مسئلہ کہ اکثریت کوئی ایسا قانون نہ بنائے جس کا اقلیت کے مذہب پر اثر پڑے اور اسکے علاوہ اور بہت سی باتیں جن کے متعلق مسلمانوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ اور ان مسائل کے متعلق ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہونا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمام حالات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے آپ کو یقین ہو جائے گا کہ آج جو کانفرنس یہاں مجتمع ہے اسے زیادہ دنوں تک ملتوی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اب ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ ہماری کوششوں کو کامیاب فرمائے اور ہمارے مباحث کا یہ نتیجہ نکلے کہ ہم یہاں سے ایک متحدہ جماعت بن کر اٹھیں، جس کا ہر فرد دوسرے کے دوش بدوش میدان عمل میں اتر آئے اور اس سے مسلمانان ہند کے اتحاد و استحکام میں ایک نئی جان پڑ جائے تاکہ بالآخر ہم سارے ہندوستان کو ایک قومی رشتہ میں منسلک کر کے متحدہ قومیت ہند کی مضبوط بنیاد رکھ سکیں۔

۱۹۳۴ء میں داخلہ کونسل کے متعلق رانچی اور پٹنہ میں کانگریس نے غور کرنے کیلئے جلسے کئے اور بمبئی میں قرطاس ابیض اور کمیونل اوارڈ پر پالیسی کا اظہار کیا گیا جسمیں اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ بطور اصول تسلیم ہوا اور صاف طور پر طے ہو گیا کہ کانگریس اسوقت تک کمیونل اوارڈ کو نہ رد ہی کر سکتی ہے اور نہ منظور ہی کر سکتی ہے جب تک اختلاف رائے قائم ہے پنڈت مالویہ اور مسٹر اینے کانگریس کے اس رویہ سے سخت بیزار تھے اور بالآخر وہ پارلیمنٹری بورڈ اور ورکنگ کمیٹی دونوں سے مستعفی ہو گئے۔ بنگال کے کانگریسی بھی مخالف تھے ان کو پونہ پیکٹ (اچھوتوں کے متعلق جو گاندھی نے کیا تھا) بھی پسند نہ تھا۔ پنڈت مالویہ اور مسٹر اینے نے اگست میں ممبران کانگریس اور دیگر لوگوں کی ایک کانفرنس مدعو کی جس نے قرطاس ابیض اور کمیونل اوارڈ کے خلاف کونسلوں میں اور انکے باہر ایجی ٹیشن کرنے کیلئے ایک پارٹی قائم کی اور ورکنگ کمیٹی کو بھی مجبور کیا کہ اپنی قرارداد پر نظر ثانی کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کا جلسہ طلب کرے لیکن ورکنگ کمیٹی نے غور و بحث کے بعد اپنے عمل کی مناسبت میں کوئی شک نہ پایا۔

گول میز کانفرنس کی کارروائیوں کے متعلق ۱۹۳۳ء میں جو جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی قائم کی گئی تھی، اس نے اب اپنی رپورٹ مرتب کر لی اور وہ ۷، فروری ۱۹۳۵ء کو اسمبلی کے سیشن دہلی میں پیش ہوئی۔ مسٹر ڈیسائی مخالف پارٹی کے لیڈر نے اس کو ختم یا مسترد کئے جانے کی تحریک پیش کرتے ہوئے کمیونل اوارڈ کی بابت غیر جانب دارانہ روش ظاہر کی۔ مسٹر محمد علی جناح نے کمیونل اوارڈ کو تسلیم کئے جانے کے متعلق ترمیم پیش کی اور اس سلسلہ بحث میں کہا کہ :—

"میری ترمیم ہے کہ جب تک ——— (حضرات! میری شرط کے تعینات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے) ——— "ہم آپس میں مل کر کوئی معقول اور اعلیٰ لائحہ عمل پیش نہ کرسکیں۔ اس وقت تک فرقہ وارانہ حل تسلیم کر لینا چاہیے حضرات میرے ہندو دوست فرقہ وارانہ حل سے مطمئن نہیں ہیں۔ بے شک ہٹیک میں خود بھی نہیں ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان بھی اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہرگز نہیں ہیں!! کیوں کہ یہ حل مسلمانوں کے درد کا پورا علاج نہیں ہے۔ اور ان کے مطالبات کو بکمال ضرورت پورا نہیں کرتا۔ حضرات میں بھی اس حل سے اپنے عدم اطمینان کا یقین دلاتا ہوں۔ اور اگر میری انفرادی رائے دریافت کی جائے تو عرض کروں گا۔ کہ ذاتی طور پر میں اس کو خودداری کے خلاف سمجھتا ہوں۔ کہ غیر قوم کے مسلط کردہ حل کو قبول کریں۔ مجھے اس وقت تک روحانی اطمینان نہ ہوگا جب تک ہندوستان کی متعلقہ اقوام فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کوئی معقول حل خود ہی تجویز نہ کرلیں گی۔ ہم کو خود اپنا حل پیش کرنا چاہیے۔..........

میں نے اس وقت آپ حضرات کے سامنے جو کچھ پیش کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے اسے قبول کرلیں۔ اصل میں یہ بات ہے کہ آپ کو خود غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ میں نے جو کچھ رائے قائم کی ہے وہ درست ہے۔ میں فرقہ وارانہ حل کو کس لئے قبول کرتا ہوں۔ زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا اور نہ ماضی کی تاریخ پر تفصیلی بحث کر کے ایوان کا زیادہ وقت لینا چاہتا ہوں۔ میں صرف اس چیز کو آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی مختلف اقوام، اور فرقوں نے بہت بڑی حد

تک باہمی سمجھوتہ کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ ہم کسی معقول نتیجہ پر نہ پہونچ سکے۔ خواہ میں اس حل کو قابل تسلیم سمجھتا ہوں یا نہیں سمجھتا ہوں، لیکن اس وقت یہ ماننے اور ظاہر کرنے کے لئے مجبور ہوں کہ فرقہ دارانہ برطانوی حل کے بغیر (ایسی حالت میں جس کا اوپر ذکر کیا گیا) کوئی دستوری اسکیم عملی طور پر کامیاب نہیں بنائی جا سکتی"۔

حضرات اس حل کو کسی طرح بھی ہم مسترد نہیں کر سکتے اور اس حالت میں اس کو نامنظور کرنے کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہم بالکل مجبور سے ہو گئے ہیں۔ میں مخالف پارٹی کے لیڈر کے جذبات و خیالات کی پوری حمایت کرتا ہوں۔ بیشک یہ درست ہے کہ سیاسیات میں مذہب کو دخیل نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ اسے دخیل ہونے دینا چاہیے اسی طرح نسل کو بھی سیاسیات پر حاوی نہ ہونے دینا چاہیے۔ گو زبان کا مسئلہ اس قدر زیادہ وسیع نہیں ہے۔ . . . .

میں یہ جانتا ہوں کہ مذہب کو سیاسیات پر دخیل و حاوی نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ مذہب کا معاملہ انسان کا اور خدا کا براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں سروکار نہیں —————— بیشک میں مخالف لیڈر سے اس بات میں متفق ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کا فرقہ دارانہ مسئلہ صرف مذہبی مسئلہ ہے۔ کیا یہ صرف نسلوں کی آویزش کا معاملہ ہے۔ کیا یہ صرف زبان کے اختلاف پر ہی مشتمل ہے۔ نہیں ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ قطعی طور پر ایک

سیاسی مسئلہ ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بہرحال حضرات یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ دوسرے ممالک میں بھی اس قسم کا مسئلہ موجود ہے یا نہیں ؟ بیشک ہے۔ ہر ملک میں اقلیتوں کا مسئلہ موجود ہے۔ اور وہاں کے لوگ بہادری کے ساتھ اِن روح فرسا حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جن کا اس مسئلہ یا اُس کے متعلقات سے تعلق ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بھی جرأت کے ساتھ اِن حالات کا مقابلہ نہ کریں، اور تمام وقتوں کے خلاف جہاد نہ کریں۔ جب دوسرے ممالک اقلیتوں کے مشکل مسئلہ کو طے کر سکتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے فرقے مایوس ہو جائیں۔ اور اس کو حل نہ کر سکیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اقلیت بجائے خود ایک دنیا ہوتی ہے۔ ریاست (اسٹیٹ) میں اقلیت ایک منفرد حالت میں بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کا خیال۔ تصور۔ تمدن۔ زبان۔ مذہب۔ نسل۔ رنگ۔ آرٹ۔ ادب غرض ہر چیز دوسری اقلیت یا دوسرے فرقہ سے متفوق ہوتی ہے۔ لیکن باوجود وہ ایک ریاست کا جزو لاینفک ہوتی ہے سوال صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ اس فرقہ کے سیاسی اور بنیادی حقوق کو عملی طور پر کس طرح قبول کیا جائے۔ فرقوں کا مسئلہ قطعی طور پر سیاسی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ ہوتا ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہمیں اس مسئلہ کو حل کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرکے اس کا صحیح و معقول حل تلاش کرنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرے معزز دوست لیڈر مخالف پارٹی نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ پہلے ہمیں حقوق مل کر حاصل کر لینے چاہئیں۔ اس کے بعد تقسیم کا معاملہ ہوتا رہے گا ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔

میں نہایت ادب کے ساتھ اس اصول کو منطقی و بنیادی طور پر غلط سمجھتا ہوں۔ اصل میں اقلیتوں کے مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے۔ پہلے حقوق طلبی و حصول حقوق پر عمل کیا جائے۔ اور تقسیم حقوق کو مستقبل کے لئے ملتوی کر دیا جائے ۔ ۔ ۔

۔ ۔

یہ کوئی جاگیر نہیں ہے کہ پہلے حاصل کی جائے گی۔ اور بعد میں اس کی حصہ پتی ہو گی۔ نہ یہ کوئی لوٹ کا مال ہے کہ بعد میں برابر کے حصے بانٹے جائیں گے۔ اگر یہ بات ہے تو گاندھی جی نے اچھوتوں کے معاملہ کے لئے کیوں فاقہ مرگی شروع کی تھی اور حصول حقوق سے پہلے تعیّن حقوق کے مسئلہ کو کیوں فوقیت دی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضرات۔ صحیح طریقہ یہی ہے جو گاندھی جی نے اختیار کیا اور میں بھی اس پر زور دینا چاہتا ہوں بے شک گاندھی جی نے ٹھیک کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ اچھوت اور پس ماندہ اقوام ہندوؤں کا پچاس ساٹھ فیصدی حصہ ہیں۔ اور ان کو راضی کئے بغیر سیاسی اقتدار ہندو قوم سے علیحدہ کرنا نہ چاہا۔ اور کسی نہ کسی طرح اِن سے معاملہ کر ہی لیا۔ میں نے انگلستان میں ان سے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ تو گاندھی جی نے جواب دیا تھا۔ کہ میں اچھوتوں کو ہندو قوم سے علیحدہ حقوق دلوانا نہیں چاہتا۔ ورنہ وہ عام ہندوؤں سے الگ ہو جائیں گے اور ہندو قوم انتشار اور سیاسی افتراق کا شکار ہو جائیگی۔ لہذا میں پہلے اِن ہی سے فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ یہ گروہ ہندو جتھے سے باہر نہ نکلنے پائے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

میں ہندو دوستوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کہ انھوں نے اچھوتوں کو اپنے حقوق میں شریک بنا کر اُن کو اپنا سیاسی حلیف بنا لیا۔ میں اسی اسپرٹ کو اپنے لئے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ پس آیئے ہمارے ساتھ بھی اسیطرح کا انصاف کیجئے۔ میرا ہاتھ دوستی کے لئے آگے بڑھا ہوا ہے آیئے اور یہی اسپرٹ دکھایئے۔ دوسروں سے لڑنے کی بجائے ہم خود کیوں نہ کسی معاہدہ پر متفق ہو جائیں۔ میں اس وقت فرقہ وارانہ حل کی بابت ان الفاظ سے زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔

اس تقریر کے بعد جس میں پوری رپورٹ پر مخالفانہ بحث تھی ترمیم منظور ہو گئی اور فرقہ وارانہ حل قطعی مستند ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اور بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس دونوں ایک فرقہ وارانہ حل کی تدبیر میں سرگرم تھے اور دونوں نے ایک فارمولا بھی مرتب کر لیا تھا مگر بنگالی کانگریسیوں نے جو اسمبلی کے موقعہ پر موجود تھے شدید

اختلاف کیا اور بالآخر دونوں کو اعلان کرنا پڑا کہ "فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کرنے کیلئے ہم نے نہایت ہی دیانت دارانہ کوشش کی کہ اس سے فریقین مطمئن ہو سکیں، ہمیں افسوس ہے کہ ہم باوجود اپنی انتہائی جد وجہد کے اس قسم کا کوئی حل تلاش نہ کر سکے۔

ہم اسے محسوس کرتے ہیں کہ ملک کی ترقی کے لئے فرقہ وارانہ یکجہتی و اتحاد نہایت ضروری ہے اور ہم صرف یہی امید کر سکتے ہیں کہ حالات جب خود سازگار ہوں گے تو آیندہ زیادہ نتیجہ خیز کوشش کا نتیجہ مل سکے گا۔"

باب ہشتم

اسمبلی کے فیصلہ کے بعد اگرچہ کمیونل ایوارڈ فی الحال ایک طے شدہ مسئلہ ہو گیا تھا اور جب تک کہ دو مراحل متحدہ طور پر نہ ہاتھ آئے اب کسی اختلاف و احتجاج کی گنجائش نہ تھی پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی اپنے صدارتی ایڈرس کانگریس منعقدہ لکھنؤ اپریل ۱۹۳۵ء میں فرقہ وارانہ فیصلہ کی بہت کچھ منطقی مذمت کے باوجود یہ کہنا ناگزیر ہو گیا کہ "اگر ہمیں جمہوریت کے اصولوں پر عمل کرنا ہے تو ہمیں مجوزہ فرقہ وارانہ تقسیم کا خاتمہ کرنا پڑے گا اور میرا خیال ہے کہ اس کا خاتمہ ہو کر رہے گا۔ لیکن فرقہ وار فیصلہ کا خاتمہ اس جارحانہ طرز عمل سے نہیں ہو سکے گا۔ جو اس کے مخالفوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس قسم کی سرگرمیاں اس فیصلہ کو زیادہ مستحکم کر دیں گی۔ کیونکہ اس طرح کی صورت حالات ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی مہلت نہیں دیتی۔ فرقہ وار فیصلہ کے متعلق کانگریس نے جو حکمت عملی گذشتہ ایام میں اختیار کر رکھی تھی مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اسکے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس حکمت عملی کی بنیاد

خالص جذبہ پرمبنی کانگریس نے ہمیشہ آزادی کے مسئلہ کو مقدم سمجھا ہے اور دوسرے مسائل کو جن میں فرقہ وار معاملات بھی شامل ہیں اس نے ہمیشہ ثانوی حیثیت دی ہے۔

اکثریت کو اقلیتوں کے شکوک اور خطرات کو دُور کرنے کیلئے فیاضی سے کام لینا چاہیئے۔ خواہ اس فیاضی میں تھوڑی بہت غیر معقولیت ہی کیوں نہ ہو فرقہ وار فیصلہ کے متعلق کانگریس کی حکمت عملی کے لئے یہ جواز کافی ہے۔

اگست ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی جو منشور شایع کیا اور اس میں فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق جو بحث کی اُس میں باوجود اس فیصلہ کی انتہائی بُرائی کے تسلیم کیا گیا کہ ملک کے خاص خاص فرقے ہی باہمی افہام تفہیم سے فرقہ وارانہ مسائل کا قابل اطمینان حل تلاش کر سکتے ہیں۔

مگر مختلف اطراف میں احتجاج کی قوت سے اس کو مسترد کرانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ بنگالی ہندؤں نے وزیر ہند کے پاس میموریل بھیجا اور پھر پنجاب میں احتجاجی کارروائیاں ہوئیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بمقام بنارس اس ایجی ٹیشن پر اظہار ناپسندیدگی کیا اور بنگال کی مہم کا بیڑہ جب بنگال پراونشیل کانگریس کمیٹی نے اٹھایا۔ تو صدر کانگریس نے اس کے سکریٹری مسٹر سرت چندر بوس سے جواب طلب کیا کہ پراونشیل کانگریس کمیٹی نے اس اہم معاملہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تجویز کردہ راستہ سے مختلف راستہ اختیار کرنے کا کیوں فیصلہ کیا۔ مسٹر سرت چندر بوس نے ایک نہایت طولانی جواب لکھا جس میں اپنے فیصلہ کی تائید کرتے ہوئے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ کانگریس

کے مینی فسٹو میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ کانگریس کی جانب سے نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو کلیتہً نامنظور کرنے میں کمیونل اوارڈ کی نامنظوری بھی شامل ہے ایکٹ کے علاوہ بھی کمیونل اوارڈ قطعی طور پر ناقابل منظوری ہے .... بنگال کے کانگریس مین اور کانگریس خیال کے آدمی محسوس کرتے ہیں کہ نئے آئین کو مسترد کرانے کیلئے ایجی ٹیشن کرنا اور کمیونل اوارڈ کو مسترد کرانے کے لئے نہ کرنا منطقی طور پر ایک ساتھ نہیں چل سکتے ...... ہماری یہ رائے ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو متفقہ طور پر طے کرنے کے لئے کانگریس کی جانب سے تمام ملک میں کمیونل اوارڈ کے خلاف ایجی ٹیشن نہایت ضروری ہے۔

اسی سلسلہ میں بابو جگت نرائن لعل پریسیڈنٹ بہار نیشنلسٹ پارٹی نے بھی صدر کانگریس کو ایک خط تحریر کیا تھا مگر اب ان کے خیالات میں بھی تغیر شروع ہوا اور جواب میں انھوں نے تسلیم کیا کہ کمیونل اوارڈ جیسے اہم معاملہ میں کانگریس غیر جانب دار نہیں رہ سکتی اور کانگریسی ممبر اوارڈ کی مخالفت میں ووٹ دینگے۔ کانگریس اس معاملہ میں غیر جانب دار یا بے لوث رویہ اختیار نہیں کر سکتی ..... پھر وہ ابتدائی غور و خوض کا موضوع حصول آزادی کے مسئلہ کو قرار دیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسی حالت میں جبکہ مختلف وجوہات کی بنا پر کمیونل اوارڈ کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا موافق نہ آئے تو اس کے خلاف خاص ایجی ٹیشن کرنے سے بڑے مقصد کو نقصان پہنچے گا کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ہم درحقیقت نئے آئین یا یوں کہئیے کہ برطانی ملوکیت پرستی کے اندر تبدیلیاں چاہتے ہیں دوم ایجی ٹیشن کا دارومدار اندرونی صورت حالات پر ہے ممکن ہے کہ کمیونل اوارڈ

کے حق میں مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کے مقابلہ سے کمیونل اوارڈ کو قائم رکھنے کے حق میں صورت حالات پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ حکومت برطانیہ ہمارے تصادم سے ضرور فائدہ اٹھائے گی۔ یہی وجہ ہے کانگریس یک طرفہ ایجی ٹیشن پسند نہیں کرتی وہ آزادی کی بنا پر ایسی صورت حالات پیدا کرنا چاہتی ہے جو کہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں امداد پہنچائے اس کے یہ معنی نہیں کہ مختلف فرقوں کے تمام فرقہ پرست لیڈر آپس میں سمجھوتہ کر لیں گے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ خواہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں سیاسی آزادی اور اقتصادی مسائل کو اہم سمجھتے ہیں وہ فرقہ وارانہ فیصلہ کو اس کی صحیح شکل میں دیکھ سکیں گے۔ اور اس کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں اشتراک عمل کر سکیں گے۔ سردست کانگریس کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ بالا دونوں وجوہ کی بنا پر یہ امر غیر پسندیدہ ہے کہ کمیونل اوارڈ کی طرف خاص توجہ مبذول کی جائے اگرچہ بلاشبہ اسکی ناپسندیدگی اور مخالفت کا اعلان ہو جانا چاہیئے۔ جیسا کہ انتخابی منشور میں کیا گیا ہے۔ اور ہم میں سے بہتوں نے انفرادی حیثیت سے یہی کیا ہے۔"

مسٹر سرت چندر بوس نے پورے عزم کے ساتھ اس ایجی ٹیشن کو بنگال سے پنجاب میں منتقل کیا انہوں نے کئی جگہ سخت تقریریں کیں اور آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے نوجوان طلبا کو اس مقصد کی غرض سے ایجی ٹیشن کرنے کے لئے ابھارا انہوں نے کہا کہ میں نوجوانوں کی اعانت سے فرقہ وارانہ فیصلہ اور جدید دستور سے ملک کو نجات دلانا چاہتا ہوں فرقہ وارانہ فیصلہ میں تمام اقوام کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے اور اس سے ہندوستانی قوم

میں نفاق و شقاق پھیلا دیا گیا ہے فرقہ وارانہ فیصلہ اور جدید دستور کے خلاف جنگ شروع کرنے میں ملک، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی امداد چاہتا ہے کیونکہ یہ صرف نوجوان ہی ہیں جو فرقہ پرستی میں وسیع النظر ہیں جو کوئی ذاتی غرض نہیں رکھتے اور ان کے پاس لوٹ مار کر کے فائدہ حاصل کرنے کی کوئی اسکیم بھی نہیں۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں مہاسبھا نے زیر صدارت پنڈت مالویہ رزولیوشن پاس کیا کہ کونسلوں اور اسمبلی میں وہ ہی ہندو منتخب کئے جائیں جو ہندو جاتی کے تحفظ حقوق کا جذبہ دلمیں رکھتے ہوں اور صرف یہ واحد مقصد پیش نظر ہو کہ ہندو جاتی کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ بھائی پرمانند نے یہ چیلنج کیا کہ "ہندوستان ہندوؤں کا وطن ہے مسلمان۔ عیسائی اور دوسری قومیں جو ہندوستان میں آباد ہیں وہ بطور مہمان ہیں اور اسی وقت تک رہ سکتے ہیں جب تک کہ وہ مہمان کی حیثیت سے رہیں"

اُردو ہندی کا سوال تو اور بھی زور پکڑ گیا حتیٰ کہ مسٹر گاندھی نے اپنی پوری طاقت ہندی کے عروج اور اُردو کی مخالفت پر مبذول کر دی اور جا بجا جلسوں میں اس کو مٹانے کی قرارداد یں پاس ہوئیں چنانچہ نومبر ۱۹۳۶ء میں لاہور میں آریہ سماج کانفرنس کے جلسہ میں کہا گیا کہ اُردو ایک بدیشی زبان ہے اور ہماری غلامی کی یادگار ہے اس زبان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہیئے اُردو نے جو ملیچھوں کی زبان ہے ہندوستان میں رواج پاکر ہماری قومی مقاصد کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

کمیونل اوارڈ کی نسبت اس جذبہ واحتجاج کے بالمقابل غیر مسلم سیاسئین

کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اس کا حامی ہے۔ چنانچہ دسمبر میں بمبئی کے مسلم طلبا کی یونین میں سر چمن لال سیتلواڈ نے تقریر کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا کہ جب تک اقلیت رکھنے والی اور اکثریت رکھنے والی اقوام میں اتحاد نہ ہو اس وقت تک جداگانہ انتخاب کے علاوہ کوئی اور صورت باقی نہیں رہتی۔ اس جلسہ کے صدر سر کاؤس جی جہانگیر تھے۔ انھوں نے بھی کہا کہ کانگریس جداگانہ انتخاب کو صرف اس صورت میں ختم کرا سکتی ہے کہ وہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کر لے۔

بنگال میں کمیونل اوارڈ کے منسوخ کرانے کی جو زبردست تحریک شروع ہوئی اُس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ امر اور قابل بیان ہے کہ دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء میں جب والسرائے ہند کلکتہ گئے تو برٹش انڈیا ایسوسی ایشن نے ایک ایڈریس پیش کیا اور اس میں بنگال کے متعلق فرقہ وارانہ فیصلہ کی تنسیخ پر زور دیا گیا مگر والسرائے نے صاف اور واضح جواب دیدیا کہ یہ فیصلہ اُس وقت تک اٹل ہے جبتک پارلیمنٹ تبدیل نہ کرے یا دونوں فرقے ازخود تبدیلی پر مائل ہوں۔

اس کے بعد بعض ہندو مسلم زعما میں صوبہ بنگال کے متعلق ایک معقول سمجھوتہ ہوا جس میں دس سال تک کمیونل اوارڈ کو بشرطیکہ باہمی معاہدہ سے ترمیم و تنسیخ نہ ہو قائم رہنے کی بھی شرط تھی لیکن دوسرے اطراف سے ہندوؤں نے شدید مخالفت کی اور یہ سمجھوتہ کالعدم ہو گیا۔

اس معاہدہ کے متعلق ڈاکٹر راد کملا مکرجی نے جو بنگال اینٹی کمیونل اوارڈ کمیٹی کے سکریٹری تھے کہا کہ یہ سمجھوتہ اس کمیونل اوارڈ کے خلاف تحریک کا نتیجہ ہے جو گذشتہ اپریل میں بنگال کی ہندو اقلیت کی جانب سے وزیر ہند کو میموریل

بھیجنے کی بنا پر شروع کیگئی تھی۔ میموریل پر مہاراج بردوان ڈاکٹر ٹیگور سر پی، سی، رائے۔ مسٹر جے این باسو سر نیل رتن سرکار کے دستخط تھے یہ میموریل ایک بڑے جلسہ میں منظور ہوا جس کے صدر ڈاکٹر ٹیگور تھے۔ اسی جلسہ میں ایک اینٹی اوارڈ کمیٹی مقرر ہوئی نیز مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس نے متعدد اجلاس منعقد کئے اور اسکی کوششوں سے سمجھوتہ ہوا۔ سمجھوتہ کے ذریعہ سے بنگال کے ہندوؤں کو ایگزیکٹیو کونسل اور ایڈمنسٹریشن میں وہ پوزیشن حاصل ہو جائے گی جس کو نئے آئین میں اُنھیں دینے سے انکار کر دیا گیا۔

امید ہے کہ مجلس آئین ساز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابر نشستیں تقسیم کر کے مستقبل قریب میں سمجھوتہ کے اصول کو لیجس لیچر تک توسیع کر دی جائے گی اور اس طریقہ پر مکمل فرقہ وارانہ حل ہو جائے گا۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان فرقہ وارانہ اختلافات مٹا کر یہ قوم پرستی کا گڈھ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ عجیب بات پھر ظاہر ہوئی کہ ایک حصہ بنگال میں ہی ایسے عمدہ حل کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا اور پنجاب کے اخبارات نے اس کے خلاف زہر فشانی شروع کر دی۔ بنگال کے متعلق یہی شرائط ۱۹۳۳ء کی جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں بھی پیش ہوئے تھے جن کو ہندو مسلم لیڈروں نے منظور کر لیا تھا لیکن اور ہندوؤں کے احتجاج سے مسترد ہو گئے۔

اکثر مسلمان سیاسی زعمانے بھی کمیونل اوارڈ کے متعلق اور اسکی تائید میں زبردست

تقریریں کیں اور ہر صوبہ میں اس کی حمایت کی گئی ان تقریروں میں سے یہاں صرف تین تقریروں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

سر وزیر حسن صدر مسلم لیگ
اپریل ۱۹۳۶ء

میں کمیونل ایوارڈ کے متعلق کانگریس کی غیر جانبدارانہ روش پر رنج اور افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کانگریس کی اس روش کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پنڈت مالویہ نے "کانگریس نیشنلسٹ پارٹی" کے نام سے ایک نئی جماعت جو کمیونل ایوارڈ کی مخالف تھی کانگریس سے علیحدہ قائم کی مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ کانگریس غلامی کے اس جوئے کو جو ہندوستانیوں کے گلے میں غیر ملکی تسلط کی وجہ سے پڑا ہوا ہے اتار پھینکنے کے معاملہ میں مسلمانوں کے اشتراک عمل کے لئے تیار نہیں ہے۔ کانگریس اس طرز عمل سے اس ضرب المثل کی حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو گئی کہ جو آدمی ہر شخص کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ کسی طرح خوش نہیں کر سکتا ہے۔

جب ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے مسٹر جناح کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ مشترکہ انتخابات کی اسکیم جو خاص شرائط کے تابع ہو منظور کی جائے تو یہ کانگریس کی ایک بڑی فروگذاشت تھی۔

۱۹۳۴ء میں بھی کانگریس نے یہ محسوس نہیں کیا کہ کمیونل اوارڈ کے معاملہ میں کانگریس کی غیر جانبدارانہ حکمت عملی کے نتائج کس قدر دور رس ہونگے۔

میری رائے میں کانگریس کی اس پالیسی نے ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کے حصول کے لئے ایک متفقہ کوشش کے لائحہ عمل کو بروئے کار

لانے میں مشکلات پیدا کردی ہیں۔ سیاسی مسائل فرقہ بازیوں سے کبھی حل نہیں ہو سکتے خواہ یہ فرقے ذہنی کرتب کے نظاہرہ کیلئے کیسے ہی نفیس ہوں۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کے خلوص اور حُبِ وطن میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی ترقی کی راہ میں ان کی عظیم قربانیوں سے کون انکار کرسکتا ہے اور ان کی عمر بھر کی قومی خدمات کے اعتراف میں کون خراج تحسین پیش کرنے کی مخالفت کرسکتا ہے لیکن میں اپنی اور آپ کی طرف سے پنڈت مالویہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس نقطۂ خیال سے کہ فریقین کے درمیان تصفیہ ہو جائے اس پیچیدہ مسئلہ پر غور فرمائیں۔ پارلیمنٹ کے خلاف کوئی ہنگامہ آرائی نہ کی جائے۔ منشا یہ ہے کہ ہم کانسٹی ٹیوشن ایکٹ سے ان تمام دفعات کو خارج کرسکیں جنہیں کمیونل ایوارڈ کہا جاتا ہے۔

میں دوسرے ہندو لیڈروں سے بھی اپیل کرتا ہوں جن کی نسبت ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مرتبہ کو بلند کرنے کے معاملہ میں مخلص اور بے غرض کارکن ہیں۔

ہندوستان کی مرکزی اور صوبجاتی ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کے متعلق مسلم کانفرنس نے جو قرارداد پاس کی ہے اس کے متعلق میں اس قابل تحقیر روش کے خلاف پُرزور الفاظ میں صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں جو میرے ہندو بھائیوں نے اس مسئلہ کے متعلق اس انداز سے ظاہر کی ہے کہ ان کے نزدیک گویا یہ مسئلہ قابل توجہ ہی نہیں۔ مسلمان اگر سرکاری ملازمتوں میں اپنے جائز حصہ پر زور دیتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ان کے دلمیں سرکاری عہدہ کے وقار اور عزت کے حصول کی تمنا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک یہ ایک خالص اقتصادی مسئلہ

ہے۔ عالم بیکاری نے اور بالخصوص ملک کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی بیکاری نے اس مسئلہ کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس ملک میں سرکاری ملازمت معاش کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے کیا گورنمنٹ نے ملک کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی اقتصادی مشکلات کے ازالہ کے لئے کوئی نئی راہ نکالی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حکومت نے اس وقت تک بیکاری کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے کوئی عملی کارروائی نہیں کی۔ بیکاری کے متعلق سپرو کمیٹی کی رپورٹ کا جو خیر مقدم صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے کیا ہے۔ اس سے ہمارے قلوب میں اعتماد کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ سرکاری ملازمتوں کا مسئلہ ابھی تک تصفیہ طلب ہے۔ اور ملک کے اعلیٰ مفاد اس امر کے متقاضی ہیں کہ فریقین کے درمیان یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے۔

راجہ صاحب سلیم پور صدر لیگ پارلیمنٹری کانفرنس صوبہ متحدہ ۱۹۳۶ء

نئے دستور کے متعلق مسلمانوں کی جو رائے ہے وہ میں انہی کے الفاظ میں بیان کئے دیتا ہوں۔ لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ انجمن ہے۔ اور جو لیگ کے پلیٹ فارم سے کہا گیا ہے وہ بلا شبہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کا قول ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی منعقدہ ۱۱۔ ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء میں نئے دستور کے متعلق یہ رزولیوشن منظور ہوا ہے۔

یہ قرار دیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اس دستور کو جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں درج ہے باشندگان ہندوستان کی مرضی کے خلاف اور ان کی اس ناپسندیدگی اور اختلاف کے علی الرغم جو ملک کی مختلف پارٹیوں اور انجمنوں کیطرف

سے کیا گیا مسلّط کرنے کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہے۔

لیگ کی یہ رائے ہے کہ ان حالات کے لحاظ سے جو ملک میں اس وقت پیدا ہیں دستور کی صوبجاتی اسکیم سے جتنا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے وہ حاصل کیا جائے اور اس کے باوجود کہ اس میں بہت سی ایسی قابل اعتراض باتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے گورنمنٹ اور محکمہ انتظام کی تمام تفصیلات میں حقیقی اختیار اور وزارت اور مجلس واضعان قانون کی ذمہ داری بے حقیقت رہ جاتی ہے"۔

گویا مختصراً اب صورت حال یہ ہے کہ نیا دستور وہ اچھا ہے یا بُرا پارلیمنٹ سے منظور ہو چکا ہے اور فروری ۱۹۳۷ء میں اس دستور کے مطابق گورنمنٹ کی تشکیل کرنے کیلئے اسمبلیوں اور کونسلوں کے انتخابات ہو رہے ہیں مسلمانوں کے مطالبات میں سے صرف ایک مطالبہ کمیونل اوارڈ کی صورت میں صاف اور واضح ہو کر منظور ہوا ہے۔ یعنی انتخاب جداگانہ اور نشستوں کا تعین۔ ہندو اسی کی مخالفت کر رہے ہیں محض اسی کی مخالفت کیلئے پنڈت مدنموہن مالوی نے کانگریس نیشنلسٹ پارٹی قائم کی ہے۔ انھیں اس پر بھی صبر نہیں آیا کہ کانگریس نے اپنے غیر فرقہ وارانہ ہونے کے دعوے کو قائم رکھنے کے لئے نہ اوارڈ کو قبول کیا ہے اور نہ مسترد کیا ہے۔ گو اوارڈ کو بُرا کہنے میں اس نے بھی کوئی کمی نہیں کی ہے۔ مسلمانوں کو اسلامی کلچر، مذہب زبانی رسم الخط کے تحفظ کا کام ابھی اتنا ہی باقی ہے جتنا اس نئے دستور کی منظوری سے قبل تھا

لیگ نے اس پیچیدہ صورت حال پر بمبئی کے اجلاس میں اچھی طرح غور کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ امور کے متعلق کوئی قطعی سمجھوتہ نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ

الیکشن کیلئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ پارٹی قائم ہو۔ مسلمانوں کو صرف مسلم پارٹی کی تنظیم کرنی چاہیئے اور تمام ہندوستان میں یہ صرف ایک ہی پارٹی ہو البتہ مجالس واضعان قانون کے اندر جب غیر مسلم پارٹی کے اصول اور مقاصد کے مطابق ہونگے اس کے ساتھ مسلم پارٹی تعاون کریگی اس معاملہ میں مسلمانوں کی بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس انتخابی مہم کے اہتمام و انصرام کا کام مسلمانوں کے محترم لیڈر مسٹر محمد علی جناح نے اپنے ذمہ لے لیا مسٹر محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت شہرۂ آفاق ذہانت اور غیر معمولی جوش عمل سے مسلمان اچھی طرح واقف ہیں اور اسی لئے ان پر پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کو اپنی گذشتہ ہفت سالہ کوششوں کے نتائج کو رائیگاں کر دینا نہیں ہے اور انھوں نے اپنے اس منصفانہ اور جمہوری نقطۂ نظر کو ترک نہیں کر دیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت اور مجالس واضعان قانون میں تمام فرقوں کے درمیان صحیح توازن قوت پیدا ہو تو اس سے زیادہ دانشمندانہ اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا جس کو انھیں قبول کرنا چاہیئے ہم اپنے ہموطنوں کے ساتھ صوبہ کی عام مخلوق کی فلاح و قومی اختیار کی ترقی اور ہندوستان کے سیاسی مدارج کو بلند کرنے کے مقاصد میں پوری فراخ دلی اور جوش کے ساتھ تعاون کرینگے۔ لیکن ہم اپنے اسلامی نقطۂ نظر کو ترک نہیں کرینگے ہم اپنے اس پہلو کو کھلا ہوا نہیں چھوڑیں گے جس پر کج فہمی سے ہمارے برادران وطن حملہ کر رہے ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب صدر انڈیپنڈنٹ کانفرنس صوبہ بہار ستمبر ۱۹۳۷ء	کمیونل ایوارڈ یہ ایک پنچ کا فیصلہ ہے جب ہم آپس میں کوئی فیصلہ باہمی اعتماد سے

نہ کر سکے تو ہم میں ہی سے بعض نے وزیر اعظم کو پنچ بنایا اور انھوں نے اپنا فیصلہ صادر فرما دیا اگرچہ ایسا فیصلہ کیا گیا کہ اس سے فریقین خوش نہیں ہوئے بلکہ اختلاف کی خلیج اور وسیع ہو گئی لیکن بہر حال پنچ کا فیصلہ ہے اور جبتک آپس میں کوئی اور فیصلہ نہ ہو اسکی حفاظت ضروری ہے۔

اس فیصلہ کی ذمہ داری ان ہندو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے باہمی سمجھوتہ کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں اور وزیر اعظم کو پنچ بنانے پر مجبور کیا۔ آج ان لوگوں پر تعجب ہے جو کل لندن میں وزیر اعظم کو پنچ بننے پر مجبور کر رہے تھے لیکن آج اس کے فیصلہ سے انحراف کر رہے ہیں۔ اس قسم کے لوگ یا تو پرلے درجہ کے احمق ہیں یا پرلے درجہ کے بدنیت ہیں جو وزیر اعظم کی نیت پر حملے کر رہے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ خود ہاتھ جوڑ کر اور مائی باپ کہکر ایک شخص کو پنچ بنایا گیا اور پھر اسکے فیصلہ کو اسی کے ہاتھوں سے مسترد کرانے کیلئے اسکو مجبور کیا جائے۔

میں اس کمیونل ایوارڈ کو نعمت غیر مترقبہ نہیں سمجھتا اور نہ مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ فیصلہ ہمیشہ رہیگا۔ یہ فیصلہ بظاہر کتنا ہی خوشنما ہو لیکن اسمیں مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافی کیگئی ہے۔ اس فیصلے نے پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت کو مجروح کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ یوروپین کے لئے بہت زیادہ مفید ہے۔ اس فیصلہ میں سرحد کے ہندوؤں کے ساتھ رعایت کیگئی ہے وہ سی۔ پی اور مدراس کے مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیگئی ایسی حالت میں یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے کچھ خوش کُن نہیں ہے لیکن جب تک کوئی باہمی سمجھوتہ طے نہیں ہوتا اُس وقت تک اس فیصلہ کو قائم رکھنا ضروری ہے جو لوگ اس فیصلہ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ ملک کے سب سے بڑے دشمن اور غدار ہیں۔ اگر آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے تو یہ فیصلہ مسترد ہو سکتا ہے ہم اس فیصلہ سے خواہ کتنے ہی غیر مطمئن ہوں لیکن باہمی سمجھوتہ سے قبل اس استرداد کو مکروہ اور مذموم سمجھتے ہیں۔" ——————

تاریخ ہذا کی قیمت سہ؍ فی جلد ہے

۵؍ آنہ کے ٹکٹ بھیجکر مندرجہ ذیل پتوں سے منگائی جاسک

(۱) مُصنّف صاحب - سول لائن - اودے بیر سنگھ کمپاؤنڈ

(۲) دفتر مسلم لیگ - آگرہ

(۳) عزیزی پریس بکڈپو - آگرہ

مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ

بدنی
کہکر ایک
میر
یہ فیصلہ بنظ
فیصلے نے
کے لئے نہیں بل
ساتھ رعایت کیگئی
حالت میں یہ فیصلہ مسلما
نہیں ہوتا اُس وقت تک
ہیں۔ وہ ملک کے سب سے بڑے
مسترد ہو سکتا ہے ہم اس فیصلہ
استرداد کو مکروہ اور مذموم سمجھتے ہیں